سہ ماہی

اکادمی

جنوری-مارچ ۲۰۲۴ء

اُترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

اتر پردیش اردو اکادمی

سہ ماہی

اکادمی مجلّہ

جلد نمبر ۲۱ جنوری-مارچ ۲۰۲۴ء شمارہ نمبر ۳

ایڈیٹر : ایس-ایم عادل حسن (سکریٹری)

معاون : محمد معاذ اختر احسن (سپرنٹنڈنٹ)

رسالے کے مندرجات سے اتر پردیش اردو اکادمی کا بہ ہر صورت متفق ہونا ضروری نہیں۔

زر سالانہ : پچاس روپے-/50 قیمت فی شمارہ : پندرہ روپے-/15

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی

وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔ 226010، فون نمبر 0522-4022924

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

ایس-ایم عادل حسن، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے میسرس اے-ایس انٹر پرائزیز، نبی نگر چکدادن پور، کاکوری، لکھنؤ سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010 سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۳
کوثر مظہری بطور فکشن ناقد	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۵
مولوی محمد باقر کا دہلی اردو اخبار اور 1857 کا استعارہ	ذاکر حسین ذاکر	۱۴
حسرت موہانی کی غزل گوئی کے کچھ امتیازی پہلو	ڈاکٹر حمد مستمر	۴۳

❑❑❑

اداریہ

اردو ادب کی تاریخ اور اس کی تعمیر وتشکیل کے قدیمی سفر کی داستان مختلف نشیب و فراز اور نظریات وتحریکات سے عبارت ہے۔ ہمارے ادب کی بنیاد اخلاقی روایات واقدار پر قائم ہے جو بلا تفریق مذہب وملت ہر انسان کو صلح وآشتی، محبت واخوت کا پیغام دیتی ہے۔ آج جب موجودہ عہد کے ادباء وشعراء اور ناقدین ومحققین کی نگارشات کا موازنہ ماقبل کے ادباء، شعراء وناقدین کی نگارشات سے کیا جاتا ہے تو ایک بڑا فرق سامنے آتا ہے جو ادب کے لیے اچھی علامت نہیں ہے۔ حالانکہ موجودہ عہد میں تخلیقی سرگرمیوں کا شور اور تحریک ونظریات کا ایک ہنگامہ ضرور ہے جس کا مشاہدہ ہر روز کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہتا ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ پہلے ہمارے ادباء وشعراء اپنی ادبی فعالیت کا مظاہرہ بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اردو کی تمام اصناف ادب کی کتابیں کثرت کے ساتھ شائع ہورہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کتابیں پڑھی بھی جاتی ہیں یا نہیں؟ لیکن یہ ایک مسئلہ ضرور ہے کہ یہ کتابیں ہمارے لیے کتنی مفید ہیں اس کا اندازہ تو ان کتابوں سے ہی ہوسکتا ہے۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ غزلوں اور نظموں کے جتنے مجموعے شائع ہورہے ہیں ان میں اعلیٰ خیالات اور بہترین افکار کم ہی نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تنقیدی کتابیں ضخیم ہوتی ہیں لیکن اپنے معیار تنقید سے زیادہ ذہنی تحفظات پر مبنی ہوتی ہیں۔ تحقیقی مقالے جو کتاب کی شکل میں شائع ہورہے ہیں ان میں بھی تحقیق کم اور دوسرے محققین وناقدین کے کوٹیشن زیادہ نظر آتے ہیں۔ ناول اور افسانوں کا بھی یہی حال نظر آتا ہے اس میں ادبیت اور تخلیقیت کو چھوڑ کر باقی سب چیزیں ملتی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ زندگی اور سماج کی قدریں روز بروز بدلتی نظر آرہی ہیں آج کے عصری مسائل پر بہت کم ادب تخلیق کیا جارہا ہے۔

اسی طرح رسائل کے مشمولات کا مطالعہ کیا جائے تو آج بھی ان ادیب، شاعر اور محقق و ناقدین سے ہی متعلق مضامین نظر آئیں گے۔ نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں پر مضامین کیوں نہیں تحریر کئے جاتے یا ان ادباء و شعراء پر تحقیقی مضامین کیوں نہیں لکھے جاتے جن کی پوری زندگی اردو زبان و ادب کا اوڑھنا بچھونا رہی۔ افسوس تو تب ہوتا ہے کہ بڑے بڑے قلم کاروں کے انتقال کے بعد بھی ان کی زندگی اور ادبی خدمات پر ایک مضمون بھی سپرد قلم نہیں کیا جاتا یہ سوچ ہی بہتر نہیں ہے۔ اس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس تخلیقی بحران کے دور میں کچھ ایسے ادباء، شعراء، ناول نگار، افسانہ نگار ڈراما نگار ہیں جن کی تخلیقات صحت مند ترویج و اشاعت کی ضامن ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے قلم کاران بزرگوں کی سرپرستی میں اس سفر کو مزید آگے بڑھائیں۔ سہ ماہی اکادمی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسے سبھی قلم کاروں کو ترجیح و فوقیت دی جائے جن کے مطالعہ سے ہمارے قارئین کے وقت کا محض اصراف نہ ہو بلکہ ان کے ادبی ذوق کی آبیاری بھی ہو سکے۔

سہ ماہی اکادمی میں ان تنقیدی و تحقیقی مضامین کو اولیت دی جائے گی، جن شعراء و ادباء، ناقدین و محققین کی خدمات کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی نئے قلم کاروں کو بھی ترجیح دی جائے گی جن کے مضامین معیاری و اعلیٰ سطح کے ہوں گے۔

اس شمارے میں مشہور فکشن ناقد کوثر مظہری کی فکشن تنقید نگاری، جنگ آزادی کے پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر کے دہلی اردو اخبار، اور جنگ آزادی کے مجاہد اور بیباک شاعر مولانا حسرتؔ موہانی کی غزل گوئی پر مضامین قارئین کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین ان مضامین پر اپنی آراء سے مطلع فرمائیں گے۔

ایس۔ ایم عادل حسن

ایڈیٹر

پروفیسر اسلم جمشید پوری
صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی
میرٹھ-Mob.8279907070

کوثر مظہری بطور فکشن ناقد

اردو ادب کی تاریخ میں ایسے بہت ہی کم لوگ ہوئے ہیں جن کا قلم نظم اور نثر دونوں میں رواں ہو۔ ایسے ہی معدودے چند ادیبوں میں کوثر مظہری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہیں گذشتہ 25 برسوں سے شعبۂ اردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کوثر مظہری نے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ آپ بہت اچھے ناقد، مترجم، ناول نگار، شاعر اور استاد ہیں۔ گو کہ آپ نے ادب کی مختلف اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے، لیکن آپ کی بنیادی شناخت ایک شاعر کی ہی ہے۔ آپ کی درجنوں کتابیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔

کوثر مظہری اچھے فکشن ناقد بھی ہیں۔ آپ کی نظر اردو فکشن خاص کر اردو ناول پر گہری ہے۔ آپ نے فکشن تنقید میں 'نیا ناول نئے تناظر' کتاب لکھ کر فکشن تنقید میں خود کو مستحکم کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب ان کے ذریعہ کرائے گئے دو روزہ سمینار کی روداد ہے جس میں تقریباً 3 درجن نئے ناولوں پر ناقدین کے مضامین و مقالات شامل ہیں۔ یہ کتاب کوثر مظہری اور امتیاز احمد علیمی کی مشترکہ کاوش ہے۔ کوثر مظہری نے کتاب کا پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ پیش لفظ میں کوثر مظہری نے موجودہ ناول کے موضوعات سے لے کر تکنیک، اسلوب اور ناول میں بیان کیے گئے معاملات کو عمدگی سے سمیٹا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ناول کے حوالے سے اپنا نظریہ بھی بیان کیا ہے:

''ناول کے لیے قرأتیت (Readability) کا وصف ہونا لازمی ہے۔یعنی یہ کہ ناول کے متن میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ قاری کو مجبور کردے کہ وہ ناول پڑھ لے۔ مجبور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ متن میں ایسے عناصر ہوں کہ قاری اس کے حصار میں ایک بار آجائے تو ناول کے اختتام تک وہ اس سے نکل نہ پائے۔ یہ ہے سحر،اور یہ خوبی ایسی ہے کہ اس میں سطحی پن بھی آجاتا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ اگر ناول نگار نے محض کوئی Gimmick استعمال کیا ہے تو اس نوع کے متن کا جادو بہت جلد زائل ہوجاتا ہے اور قلعی بھی کھل جاتی ہے۔ ناول نگار کو اپنے اسلوب اور مواد (Content) میں ایک ایسا رشتہ بنا کے رکھنا چاہیے کہ کہیں سے بھی ڈھیلے پن کا احساس نہ ہو۔''(نیا ناول، نیا تناظر، ص 7)

مذکورہ کتاب میں تقریباً اکیسویں صدی کے 35 ناولوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جس میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مشہور ناول 'کئی چاند تھے سرآسماں' سے لے کر موجودہ عہد میں لکھے گئے ناول نعمت خانہ (خالد جاوید)، روحزن (رحمان عباس)، اوڑھنی (نصرت شمسی) تعاقب (ممتاز عالم رضوی)،خلش (سفینہ بیگم)،لفظوں کا لہو(سلمان عبدالصمد) تک کا تفصیلی جائزہ موجود ہے۔ اردو ناول خاص کر اکیسویں صدی میں لکھے گئے ناولوں پر یہ کتاب دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو ناول پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے کافی مفید ہے۔آپ کی ایک اور کتاب 'منٹو شناسی اور شکیل الرحمٰن' ہے جس نے ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی حاصل کی۔منٹو پر کام کرنے والوں میں پروفیسر شمس الحق عثمانی، وارث علوی، اسلم پرویز، نگار عظیم، ہمایوں اشرف کے علاوہ پروفیسر شکیل الرحمٰن کے نام لیے جاسکتے ہیں۔منٹو شناس شکیل الرحمٰن نے منٹو کے افسانوں، کرداروں اور منٹو کے حالات زندگی کو اپنے طور پر پیش کیا ہے۔کوثر مظہری نے منٹو کی تخلیقات پر شکیل الرحمٰن کی تنقید کا بہترین جائزہ لیا ہے۔انھوں نے شکیل الرحمٰن کی منٹو شناسی پر متوازن تنقید پیش کی ہے۔یعنی انھوں نے جہاں شکیل الرحمٰن کی منٹو تنقید کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شکیل الرحمٰن نے جس خوبصورتی سے منٹو کے باطن میں اتر کر ان کی تعبیر وتشریح کی ہے، اس کی نظیر بھی دوسرے ناقدین فن کے یہاں مشکل سے ملے گی۔'' (منٹو شناسی اور شکیل الرحمٰن، ص 11)

کوثر مظہری بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کی نعت، غزلوں اور نظموں کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، لیکن فی زمانہ ان کی شناخت ایک ناقد کے طور پر ہے۔ انھوں نے ادب کی مختلف اصناف کا جائزہ لیتے ہوئے تنقید کی ہے۔ شعری ادب پر ان کی تنقید بہت اہمیت کی حامل ہے۔ شاعری کی تنقید کے حوالے سے ان کی کئی کتابیں اور مضامین کے مجموعے آ چکے ہیں۔ ان کی کتاب 'جدید نظم: حالی سے میراجی تک' نظم کی تنقید کے حوالے سے ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ فکشن تنقید پر بھی آپ کی بڑی گہری نظر ہے۔ ناول تو آپ کا خاص میدان ہے۔ ناول اور افسانے پر آپ کے کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین نئی نسل کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فکشن تنقید پر آپ کے بہت سے مضامین، تنقیدی مضامین کے مجموعوں، جرأت افکار، ارتسام وغیرہ میں شامل ہیں۔

آپ نے نئے ناولوں پر کافی لکھا ہے۔ نئے ناولوں کے موضوعات خاص کر عصری ناولوں کے موضوعات کیسے ہوں، ان ناولوں میں اسلوب و کردار کی کیا اہمیت ہے، وغیرہ کو سمجھنے کے لیے ان کے مضمون ''نئے ناولوں کے موضوعات واسالیب'' کا مطالعہ بے حد اہم اور ضروری ہے۔ آپ کے اس مضمون میں قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، ناصرہ شرما، الیاس احمد گدی، علی امجد، شفق، عبدالصمد، مظہر الزماں خاں، غضنفر، پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی، علی امام نقوی، یعقوب یاور، آشا پربھات وغیرہ کے ناولوں کے موضوعات اور ان کے اسالیب پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

''معاملات حسن وعشق، سیاسی ومعاشرتی امور، تقسیم وطن، ہجرت، فساد، کرفیو — یہ چند ایسے موضوعات ہیں جن کے گرد ناول نگاروں کے قلم گردش کرتے ہیں۔ تقسیم ہند سے پیدا شدہ حالات پر مبنی بہت سے اہم ناول لکھے گئے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل ہونے کی صورت اس لیے پیدا نہیں ہوسکتی کہ یہ ایک امیبائی تقسیم (Amoebic Division) ہے۔ ایسا

ایک ایسا یک خلیائی (Unicellular) ذی روح ہے جس کے آپ چاہے جتنے ٹکرے کر دیجیے، ہر ایک ٹکڑا مکمل اکائی کی حیثیت رکھتا ہے، سوا اپنے اصل بطن سے جدائی کا احساس دونوں طرف رہتا ہے۔لہو اور نفسیات میں جو احساس رچ بس جائے اسے بلوٹنگ پیپر سے بھی ہم آپ چھان نہیں سکے۔لہٰذا اس تقسیم کے موضوع پر آج بھی ناول لکھے جا رہے ہیں......

1980 کے بعد اس موضوع پر کئی اہم ناول لکھے گئے۔خواب رو (جوگندر پال)، دو گز زمین (عبدالصمد)، زندہ محاورے (ناصرہ شرما) فرار (ظفر پیامی)، آنگن اور زمین (خدیجہ مستور) وغیرہ۔اس موضوع کے تحت یہاں صرف ناصرہ شرما کے ناول ''زندہ محاورے'' کے حوالے سے بات ہوگی۔''

(ارتسام،ص 76-375)

کوثر مظہری نے اپنے مضمون 'ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نقاذ' میں منٹو شناسی پر اپنے طور سے کئی سوال قائم کیے ہیں۔انھوں نے اس مضمون میں منٹو کے مشہور افسانے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' پر اب تک کی گئی تنقید کا جائزہ لیا ہے اور ان نکات کی طرف اشارہ اور بحث بھی کی ہے جن کی طرف دیگر نقادوں کا ذہن نہیں گیا ہے۔انھوں نے اپنے طور پر افسانے کی قرأت اور معانی کی تفہیم کی کوشش کی ہے۔ان کی نظر میں یہ افسانہ اپنے مرکزی کردار ٹوبہ ٹیک سنگھ کا افسانہ ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانے میں ایک پاگل خانے کا ذکر کیا ہے جس میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاوہ آٹھ نو دیگر پاگل بھی ہیں، جن کی اپنی اپنی کہانی ہے اور جو مختلف عمل سے افسانے میں ایک کردار ادا کرتے ہیں۔کوثر مظہری کا ماننا یہ ہے کہ یہ سبھی وہ پاگل ہیں جو صد فیصد پاگل نہیں ہیں بلکہ ہوشمندی کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں، پتہ نہیں منٹو ان پاگلوں کی حرکات وسکنات سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔انھوں نے اپنے اس افسانے کے ذریعہ اس افسانے کی تفہیم کی ہے اور اپنے معروضات پیش کیے ہیں۔

''یہی وہ نقطہ اتصال ہے یا بقعۂ انوار، جہاں سے تہذیبی بوقلمونی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔کسی بھی افسانے کی تشریح و تعبیر کے لیے اس کے متن

کے استعاروں، علامتوں، اساطیر اور تہذیبی و ثقافتی ارتعاشات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے اور یہی وہ لمحہ ہے جب بشن سنگھ کا چیخ مار کر مرجانا اپنے پیچھے تہذیب کا ایک بہت ہی واضح اور توانا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ بلکہ اب وہ ایک اسطور میں مبدل ہو جاتا ہے۔ وارث علوی اور شکیل الرحمٰن نے بشن سنگھ کو ایک درخت تصور کیا ہے جس کی اپنی جڑیں زمین کے اندر دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اپنے اندر ساخت اور بافت دونوں لحاظ سے درخت کی جڑوں کی طرح بشن سنگھ کے وجود میں پھیلی ہوئی کہانی ہے۔ دراصل یہ افسانہ تقسیم ہند یا کسی پاگل یا مختلف پاگلوں کے بجائے تہذیبی نشان کی کہانی پیش کرتا ہے۔ (ارتسام،ص 399)

پریم چند کی روایت کو بعد میں حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ نے آگے بڑھانے کا کام کیا۔ سہیل عظیم آبادی نے کئی خوبصورت افسانے اور ایک یادگار ناولٹ اردو ادب کو دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سہیل عظیم آبادی پر پریم چند کے کافی اثرات تھے۔ سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانوں اور ناولٹ میں دیہات اور عام انسانوں کو پیش کیا ہے۔ کوثر مظہری نے سہیل آبادی کے ناولٹ 'بے جڑ کے پودے' پر ایک تفصیلی اور تجزیاتی مضمون قلم بند کیا ہے۔ کوثر مظہری نے ناول کی کہانی، کردار، واقعات، اسلوب، علاقے کے مسائل اور ہم عصریت کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ناولٹ میں ایک خط کا بار بار ذکر آیا ہے۔ کوثر مظہری نے ناولٹ میں اس خط کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ دراصل یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے نیا نہیں تو عام بھی نہیں ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے عیسائی مذہب کے ذریعہ آدی واسیوں کو عیسائی مذہب کی طرف راغب کرنے کے مشن کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں مسٹر سنہا، نورا، بشپ، مس گرین، فریڈی، ارنسٹ، آرتھر، مارتھا، بونجی کو کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناولٹ کی زبان بہت اچھی ہے۔ کوثر مظہری نے اپنے تجزیے اور تبصرہ کے بعد یہ بات واضح کی ہے کہ سہیل عظیم آبادی کا یہ ناولٹ شاہکار ہے مگر ہمیں اپنی جانب مجذوب کرتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

موضوع: اس ناول کا موضوع بالکل اچھوتا تو نہیں لیکن کم یاب ضرور ہے۔
''مشن کمپاؤنڈ'' جو عیسائی مذہب کی ترویج و اشاعت کا مرکز ہے اسی میں دو بچے ارنسٹ اور نورا ہیں جن کے والدین کا کچھ اتا پتہ نہیں۔ یہ مشن کمپاؤنڈ ایک بیج کا باہری خول ہے۔ دراصل ان دو بچوں کے اردگرد کہانی چلتی ہے۔ اس کتاب کا نام استعاراتی وعلامتی ہے۔ حالاں کہ ان کی گمشدہ جڑ کا انکشاف آخر میں خود مسٹر سنہا بستر علالت پر کردیتے ہیں جوان دونوں کے والد ہیں۔
اگر اس ناول کے موضوع پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ سہیل عظیم آبادی نے اس کے ذریعہ سماج میں ناجائز تعلقات کی دُھند کو Penetrate کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ارتسام، ص 402)

انور عظیم کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں زمانے دیکھے۔ انور عظیم کے افسانوں میں کہیں کہیں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں اور جدیدیت کا خاصا اثر ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ 'کھوپڑی' جیسا افسانہ انور عظیم کی یاد دلاتا ہے۔ کوثر مظہری نے انور عظیم کے افسانے 'اونگھتی ڈیوڑھی، جاگتے کھیت' کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مضمون قلمبند کیا ہے۔ کوثر مظہری نے اپنے اس مضمون کے ذریعہ انور عظیم کے افسانے کے تعلق سے بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ کہانی میں جاگیردارانہ نظام ہے اور پریگوا، ریاض، جیٹھنا، بوڑھا قاضی، کلیا مانجھی، جیٹھنا کی بیوی وغیرہ کو دیہات کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ جدیدیت کے زمانے میں گاؤں دیہات کے مسائل پر افسانے بہت کم لکھے گئے ہیں۔ انور عظیم نے اپنے اس افسانے میں گاؤں دیہات کی اچھی منظر کشی کی ہے۔ انور عظیم کی ایک کہانی کا اقتباس دیکھیے:

''سامنے دھان کے کھیتوں میں کٹے ہوئے دھان کی کھوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ کھلیان میں دھان کی پیلی پیلی مونچھیں چمک رہی تھیں۔ سرشتے میں منشی اور تحصیل دار پیلے پیلے کھیتوں پر جھکے ہوئے ناریل پی رہے تھے اور دھوتی کے ایک گوشے میں زکام کی ریزش کو جذب کرتے جاتے تھے۔''

(مجموعہ: دھان کٹنے کے بعد، ص 200)

کہانی میں طبقاتی کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔کوثر مظہری نے اپنے مضمون میں کہانی کے مقصد کو پیش کیا ہے اور طبقاتی کشمکش اور منظر نگاری پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

''سرخ اور پیلا رنگ دو طبقوں کی شناخت کراتے ہیں۔ سرخی تو کمیونزم کا رنگ ہے اور زرد یعنی پیلا رنگ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی علامت ہے۔یہیں سے دونوں طبقوں میں تصادم کا اشاریہ تیار ہوتا ہے اور آخر کار تصادم کے نتیجے میں سرخ والی جماعت کو پیلے رنگ والی جماعت پر فتح حاصل ہوتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کہانی کی جو روپ ریکھا ہوتی ہے، اور جو مرکزی خیال ہوتا ہے، اس میں اگر منظر نگاری سے کوئی مدد ملتی ہے تو اس کی ہمہ گیریت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ورنہ منظر نگاری فضول ہے۔''(ارتسام،ص415)

مشرف عالم ذوقی موجودہ عہد کے مشہور و معروف ادیب وصحافی ہیں۔انھوں نے کئی مشہور ناول: بیان، ذبح، پوکے مان کی دنیا، لے سانس بھی آہستہ،شب گیر، مرگ انبوہ، مردہ خانے میں عورت، ہائی وے پر کھڑا آدمی وغیرہ اور کئی افسانوی مجموعے غلام بخش، بھوکا اتھوپیا، صدی کو الوداع کہتے ہوئے، لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، انجانے خوف کا ریہرسل کے علاوہ سیکڑوں مضامین تنقید اور صحافت کو دیے ہیں۔مشرف عالم ذوقی کے ہر ناول پر تفصیلی گفتگو ہوسکتی ہے۔لیکن کوثر مظہری نے ان کے ناول 'پوکے مان کی دنیا' پر ایک تفصیلی مضمون بعنوان 'مشرف عالم ذوقی کا ناول 'پوکے مان کی دنیا' تحریر کیا ہے۔

دراصل ذوقی کا یہ ناول اردو ناول کی روایت میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ذوقی نے اس ناول میں بچوں کی بدلتی ہوئی ذہنیت اور نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔آج کل کے بچوں کے کھیل بھی الگ قسم کے ہوگئے ہیں۔جاپان اور دوسرے ممالک کے ذریعہ ایجاد کردہ بہت سے کارڈ، گیم اور کردار بچوں کی پسند کا معیار بن رہے ہیں۔جن سے بچوں میں عمر سے پہلے ہی جنسی رجحان بڑھ رہا ہے۔پوکے مان کی دنیا ناول میں مشرف عالم ذوقی نے دس بارہ سال

کے لڑکے اور لڑکی کو جنسی عمل سے گزرتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس سے جہاں لڑکی کے گھر والے بدنامی جھیلتے ہیں وہیں لڑکے کے گھر والے بھی ذہنی خلفشار کا شکار ہوتے ہیں۔ جج، عدالت، وکیل بچوں کی اس حرکت سے پریشان ہیں۔ کوثر مظہری نے اس ناول کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے پوکے مان کے ذریعہ بدل رہی بچوں کی ذہنیت اور زمانے کے بدلاؤ کو نشان زد کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے مضمون میں جیمس جوائس، فلابیر، آر کے میڈیس، وارث علوی وغیرہ کے ناول سے متعلق بیان کو بھی شامل کیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے مشرف عالم ذوقی کے ہم عصر ناول نگاروں کے ناول پر بھی ایک نظر ڈالی ہے۔

کوثر مظہری نے 'پوکے مان کی دنیا' کے مختلف کرداروں اور ان کے ذریعے ادا کیے گئے مختلف مکالموں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ کوثر مظہری نے مشرف عالم ذوقی کے اس ناول پر اپنی بیباک رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پوکے مان کی دنیا' آج کے انسانوں اور ان کے اعمال کی لایعنیت کو پیش کرتا ہے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ لایعنیت میں کتنی معنویت ہے اور اس کا انسلاک شعور فن سے کس طرح پیدا ہو جاتا ہے۔ اوہام پرستی نے حقیقت پر فوقیت حاصل کر لی ہے، جس کی تازہ مثال 'پوکے مان کی دنیا' ہے اور جو ہماری نئی نسل کے ذہنوں کو اپنے حصار میں لے چکی ہے۔ ذوقی نے شاید پوکے مان کی دنیا کی قلب ماہیت کی ہے اور Metamorphosis کے عمل سے نئی نسلوں میں اس کے اثرات منتقل کر دیے ہیں۔ ساتھ ہی ایسا ممکن اس لیے بھی ہو سکا ہے کہ ذوقی Ilusion of Reality کو سمجھتے ہیں کیوں کہ بغیر اس کے حقیقت کو فکشن نہیں بنایا جا سکتا۔'' (ایضاً، ص 453)

کوثر مظہری نے اپنی کتاب 'ارتسام' میں 'رنگ فکشن' کے عنوان سے کئی اور مضامین لکھے ہیں۔ مثلاً ذکیہ مشہدی کی کہانی ہدو کا ہاتھی، طارق چھتاری کا افسانہ 'آن بان' کی آزاد قرأت اور خالد جاوید کا افسانہ 'تفریح کی ایک دوپہر' وغیرہ۔ کوثر مظہری نے مشہور افسانہ نگار ظفر اوگانوی کے افسانے 'باؤلی اور ٹینک' کا تجزیہ کیا ہے جو ڈاکٹر دبیر احمد کی مرتب کردہ کتاب

’ظفر اوگانوی‘ کا ورق کے تناظر میں شامل ہیں۔ اپنے اس تجزیاتی مضمون میں کوثر مظہری نے ظفر اوگانوی کی شخصیت اور فن کو سمیٹا ہے۔ انھوں نے افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت گہرائی سے اس کے وقوعات اور کرداروں کا جائزہ لیا ہے۔ ساتھ ہی جدیدیت پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ کوثر مظہری، ظفر اوگانوی، ان کے افسانے باولی اور ٹینک اور جدیدیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’ظفر اوگانوی جدیدیت کے زیر اثر کہانیاں لکھ رہے تھے۔ چونکہ وہاں انفراد اور موضوعیت یعنی Subjectivity کو بھی اہمیت دی گئی ہے، اس لیے یہاں بھی ’باوَلی‘ باطن کی عمیق گہرائیوں کو نشان زد کرتی نظر آتی ہے۔ ایسے میں یہ کہانی پوری طرح ایک وجودی فکر پر محمول کہانی بن جاتی ہے۔ بہر حال یہ ایک کامیاب کہانی ہے اور جدید اردو فکشن کی تاریخ میں ظفر اوگانوی کا نام روشن رہے گا۔‘‘
>
> (ظفر اوگانوی، بیچ کا ورق کے تناظر میں، ص 274)

کوثر مظہری یوں تو بنیادی طور پر شاعر اور تنقید نگار ہیں، لیکن انھوں نے ایک ناول بھی لکھا تھا، ان کا ناول ’آنکھ جو سوچتی ہے‘ اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن 2000 اور دوسرا ایڈیشن 2021 میں سامنے آیا۔ کوثر مظہری نے ترجمے کا بھی خاصا کام کیا ہے۔ خلیل جبران کے مشہور ناول The Broken Wings کا اردو ترجمہ ’شکستہ پر‘ کے عنوان سے کیا جو 1996 میں منظر عام پر آیا۔ اگر دیکھا جائے تو کوثر مظہری کے اندر ایک فکشن نگار اور بیباک فکشن ناقد موجود ہے۔ کوثر مظہری نے اردو فکشن پر جو تنقید کی ہے اس میں انھوں نے بعض مقامات پر مصنف کے نظریے کی مخالفت بھی کی ہے اور مصنف کی جو بات ان کو پسند آئی ہے اس کی تعریف بھی کی ہے، یعنی کوثر مظہری کی تنقید میں ایک طرح کا توازن ملتا ہے۔ ایسا توازن جو مدلل ہے۔ وہ بیباک تنقید نگار ہیں۔ وہ اپنے نظریے کو بلا تامل پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی جس فن پارے کا وہ جائزہ لیتے ہیں اس کے معاصر لکھنے والوں اور عصری مسائل کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

❑❑❑

ذاکر حسین ذاکر
شانتی نگر، دیوریا-Mob.9415276138

مولوی محمد باقر کا دہلی اردو اخبار اور 1857 کا استعارہ

ملک میں اردو زبان کا پہلا اور مکمل اخبار دہلی سے مولوی محمد باقر نے 1836 میں جاری کیا۔ اس کا نام 'دہلی اردو اخبار' تھا۔ یہ اخبار 1857 تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار نے ملک کی پہلی جنگ آزادی اور صحافتی دنیا میں بہت اہم رول ادا کیا۔ مولوی باقر نے بیس سال کے عرصے میں اس اخبار کا نام تین بار تبدیل کیا۔ اجرا کے وقت اس اخبار کا نام دہلی اخبار تھا۔ 10 مئی 1840 سے انہوں نے اس کا نام تبدیل کر کے دہلی اردو اخبار کر دیا۔ 12 جولائی 1857 کو مولانا نے پھر ایک بار اس اخبار کا نام تبدیل کیا اور اس کا نام بہادر شاہ ظفر کے نام سے موسوم کرتے ہوئے 'اخبار الظفر' کر دیا۔ یہ اس وقت ہوا جب 1857 کی جنگ آزادی کا عروج کا زمانہ تھا۔ 13 ستمبر 1857 کو اس کا آخری شمارہ شائع ہو سکا۔

مولوی محمد باقر دہلی کالج کے اکابر فارغین میں سے تھے اور ظاہراً انہیں اخبار نکالنے کی ترغیب دہلی کالج سے ہی حاصل ہوئی تھی۔ حالانکہ دہلی کالج سے اپنی تعلیم کی فراغت کے بعد انھوں نے اسی کالج میں کچھ دن تک درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دئے۔ پھر جلد ہی اسے چھوڑ کر وہ انگریزی عملداری کی انتظامیہ میں آ گئے۔ انہوں نے ریونیو محکمہ جوائن کیا۔ پہلے امین کے عہدے پر ان کی تقرری ہوئی، پھر ترقی کر کے تحصیل دار ہو گئے۔ انہوں نے اخبار شائع کرنا

شروع کیا تو بھی اپنی نوکری سے استعفیٰ نہیں دیا۔اخبار کے پرنٹر پبلشر کے طور پر موتی لال کا نام شائع ہوتا رہا۔1843 میں مولوی محمد باقر نے ایک اہم فیصلہ لیتے ہوئے اپنی تحصیلداری کی نوکری چھوڑ دی اور باقاعدہ اخبار نویسی کا کام کرنے لگے۔20اپریل 1848 سے اخبار کی پرنٹ لائن پر بحثیت مہتمم مولوی باقر کے ہونہار صاحبزادے مولانا محمد حسین آزاد کا نام شائع ہونے لگا۔اس وقت تک مولانا آزاد تقریباً18 سال کے ہو چکے تھے۔

مولوی محمد باقر نے دہلی کالج کی نوکری ضرور چھوڑ دی۔مگر دہلی کالج انتظامیہ سے ان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ان کی انگریز دوستی بہت مشہور تھی۔انہوں نے جب اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا تو انہیں دہلی کالج کا پرانا لیتھوگرافی پریس سستے داموں میں مل گیا۔دہلی اردو اخبار انگریزوں کی سرپرستی میں شائع ہوا۔مولوی باقر نے 1857 کی بغاوت سے قبل کبھی اپنے اخبار میں انگریزی حکومت اور اس کے انتظامات کو نشانہ نہیں بنایا۔اس کی ایک مثال 17 جنوری 1841 کی ایک رپورٹ ہے، جس میں راجپوتانے میں کسی مقام پر عوامی سرکشی کی اطلاع دی گئی ہے۔اس خبر میں اخبار نے انگریز حکام کی تدابیری حکمت عملی کی خوب تعریف کی ہے۔انگریزوں کے ذریعے اس سرکشی کو بہت سرعت سے فرو کرنے پر اخبار خوشی کا اظہار کرتا ہے۔اس نے لکھا۔(1)

مولوی محمد باقر کی صحافت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظریات پر مبنی تھی۔وہ اخبار کے ذریعے اچھائی کو پھیلانا اور برائی کو روکنا چاہتے تھے۔اس لئے ان کی زیادہ تر خبریں اخلاقی نوعیت کی ہوتی تھیں۔اچھائی اور برائی کے فیصلے میں وہ کئی بار جج بھی بن جاتے تھے اور لوگوں کی ذاتیات پر سیدھا حملہ کر دیتے تھے اور ایسی خبریں بھی لکھ دیتے تھے جس سے ان کے مخالفین کی شبیہ خراب ہو جائے۔وہ اپنے مخالف علما کو کسی فروگزاشت پر تو قطعی معاف نہیں کرتے تھے۔ان لوگوں کو بھی نہیں جو قلعہ کی بدنظمی اور بدعنوانی میں ملوث ہوتے۔ہاں ایک بات ضرور تھی کہ وہ شہنشاہ ظفر کی بڑی عزت کرتے اور انہیں فرشتہ صفت بادشاہ کہتے تھے۔وہ اپنے اخبار میں انہیں 'حضور والا' کے نام سے یاد کرتے۔وہ اسی عنوان سے مستقل کالم بھی لکھتے اور قلعہ کے

بدعنوان امراء اور وزراء کی خوب خبر لیتے۔ وہ چاہتے تھے کہ درباری سرگرمیوں سے شہنشاہ کو باخبر رکھا جائے۔ مولوی محمد باقر نے 23 مئی 1841 کو دہلی کے سپرنٹنڈنٹ کے نام ایک مراسلہ لکھا، جس میں مجرمانہ عادتوں والے درباریوں کے ذریعے نیک دل بادشاہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی جیبیں بھرنے کی تفصیل ہے۔ اس مراسلے میں وہ اپنے قدیمی حریف حکیم احسن اللہ خاں پر کچھ دیگر اہلکاروں کے ساتھ مل کر رقم خرد برد کرنے کا الزام لگاتے ہوئے جانچ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

> ''افواہ عام ہے کہ قلعہ میں عجب طرح ہو رہی ہے۔ شہر میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں الغیاث وفریاد اہلکاران شاہی کا ذکر نہیں ہے۔ تنخواہوں کا یہ حال ہے کہ کسی کے پانچ مہینے، کسی کے چار مہینے، کسی کے تین مہینے چڑھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ حضور رس ہیں یا مختار سے یا حاکم معالج حضور والا سے سازش رکھتے ہیں البتہ وہ ماہ بہ ماہ تنخواہ لے جاتے ہیں۔ (2)۔''

12 مئی 1841 کے شمارے میں حلقہ چرگونگ پر انگریزوں کے محاصرے کی دلچسپ رپورٹ شائع ہوئی ہے جسے انگریزوں نے دو ہفتوں کی کوششوں کے بعد فتح کر کے لوٹ لیا۔ ہندوستانی راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس رپورٹ کو وہ آگرہ کے اخبار کی مدد سے تیار کرتے ہیں۔ ''اخبار آگرہ سے ظاہر ہے کہ 21 مارچ ماہ گزشتہ کو قلعہ مذکور الصدر کو سپاہ انگریزی نے فتح کر لیا مگر ابھی حال مفصل معلوم نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ فوج انگریزی سامنے قلعہ کے گیارہ روز تک پڑی رہی کچھ عجیب نہیں کہ سپاہ انگریزی میں سے بھی بہت نقصان ہوا ہو۔ ٹھاکر اور بڑے بڑے رفیق اس کے قلعہ میں سے بھاگ گئے اور ہرگز باوجود اس بات کے کہ قلعہ بیچوں بیچ میدان کے تھا فوج کے ہاتھ نہ آیا۔'' (3)

ایک ہفتے بعد دہلی اردو اخبار قلعے کی فتح کی اطلاع کچھ یوں دیتا ہے۔

> ''تحقیق دریافت ہوا کہ یہ قلعہ فتح ہو گیا اور ٹھاکر قلعہ کا بھاگڑ میں بہت سامان اسباب چھوڑ کر بھاگ گیا اور سپاہ انگریزی نے اسے لوٹا اور جس

وقت کہ یہ لوگ لوٹ رہے تھے ایک میگزین میں قلعہ کے آگ لگ گئی اور اس
صدمہ سے لوٹنے والوں میں سے اسی آدمی مرگئے اور پچہتر زخمی ہوگئے'' (4)

مولوی باقر شہزادوں کی بدعنوانیوں کا بھی پردہ فاش کرتے رہتے ہیں۔ 10 مئی 1840 کے شمارے میں ایک مقروض شہزادہ مرزا شاہ رخ کی خبر شائع ہوئی جس میں قرض دینے والوں نے شہزادے کا پیچھا قدم شریف تک کیا۔اس کے لئے انہوں نے قلعہ کے ملازمین کی نالائقی اور ظلم و بدعنوانیوں کو ذمہ دار قرار دیا۔ وہ مقامی سیاست، شیعہ سنی تنازعات اور دنگے فساد کی بھی خبریں اہمیت کے ساتھ شائع کرتے تھے۔قلعہ کی خادماؤں کے معاشقوں اور جنسی استحصال پر کافی تفصیل سے خبریں شائع ہوتی تھیں۔ وہ یہ بھی لکھتے کہ کون کون سی خادمائیں حاملہ ہوگئیں اور اس کی پاداش میں کن کن لوگوں کو کیسی کیسی سزائیں دی گئیں۔

انگریز قوم کی بدچلنیوں پر بھی وہ طویل رپورٹیں شائع کرتے تھے۔ حالانکہ دہلی اردو اخبار کے معاصر اخبارات اسے ایک گپ باز اور جھوٹ پھیلانے والے اخبار میں شمار کرتے تھے۔ ایک ایسا اخبار جو فیک خبریں پھیلاتا ہو۔انہیں سارے سوالوں اور شکایتوں کے بعد سی پی سی اسمتھ smith نے اپنے اعلیٰ افسران کو ایک رپورٹ بھیجی جس میں دہلی اردو اخبار کو دریدہ دہن اخبار کے نام سے موسوم کیا اور کہا کہ دہلی اردو اخبار ذاتیات کی خبروں سے بھرا رہتا ہے۔ ''یہ ایک گندہ اخبار ہے جو ذاتیات سے بھرا رہتا ہے۔ مقامی باعزت شرفا جو ایڈیٹر کے مذہبی خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں یا جن سے وہ کسی اور وجہ سے ناراض ہیں ان پر اپنے اخبار کے صفحات میں براہ راست یا بالواسطہ حملے کرتا ہے (5)۔''

اس رپورٹ کی اطلاع جلد ہی مولوی محمد باقر کو مل گئی۔انہوں نے اپنے دو شماروں 7 اگست 1853 اور 12 اگست 1853 میں اخباری ضابطہ اخلاق Ethics of Jounalism کے عنوان سے ایڈیٹر کے فرائض منصبی اور ذمہ داریوں کے تعلق سے کچھ اصولی ضابطہ اخلاق شائع کیا' جسے ہم اردو کا پہلا اخباری ضابطہ اخلاق کہہ سکتے ہیں۔'' ایڈیٹر کو ایسا مواد

چھاپنا چاہیئے جس سے اس کا اخلاقی معیار قائم ہواور لوگوں کا معیار اور کردار بلند ہو۔ان مقاصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایڈیٹر خود اپنی اچھی مثال پیش کرے(6)۔''

1850 کی دہلی کے دو اخباروں کا جائزہ :

ایک انگریزی اخبار تھا' دہلی گزٹ' جو دہلی اردو اخبار سے بالکل مختلف نوعیت کی خبریں شائع کرتا تھا۔ان دونوں اخباروں میں اتنا فرق تھا کہ جس کا مشاہدہ ولیم ڈیلرمپل نے ''آخری مغل'' میں کیا ہے۔ان کے مطابق ان دونوں اخباروں کی ایک سال کی فائلوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا جیسے یہ دو مختلف شہروں کے مسائل کی عکاسی کر رہے ہوں۔دہلی گزٹ میں جو خبریں شائع ہوتیں ان کا مولوی باقر کے دہلی اردو اخبار سے دور دور تک کوئی علاقہ نہ تھا۔دہلی گزٹ کا ایڈیٹر جارج ویگن ٹرائبر ایک سخت گیر قسم کا انگریز تھا جو صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی فلاح و بہبود اور اس کے ملازمین کے مسائل سے ہی دلچسپی رکھتا تھا۔وہ ہندوستان میں کام کررہے انگریزوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور کمپنی کن کن محاذوں پر برسر پیکار ہے، ان کی دلچسپ کہانیاں لکھتا تھا۔اس کے علاوہ بھی اس کے اخبار میں بہت کچھ ہوتا تھا۔جیسے انگریزوں کی ڈانس پارٹیاں، مسوری اور نینی تال میں خالی بنگلوں کی تفصیلات درج ہوتی تھیں۔تاکہ کسی کو ضرورت ہو تو اسے زیادہ پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔انگریزوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی سہولیات کا ذکر ہوتا۔ولایت سے آنے والی نئی بیگموں کی پریشانیاں اور کچھ معاشقے بھی اس کے اخبار کی زینت بنتے۔جیسا کہ ظاہر ہے ویگن ٹرائبر ہندوستانی مسائل کا اتنا ہی ذکر کرتا جتنا باقر انگریزوں کی ڈانس پارٹیوں کا(7)۔

اس کے برعکس دہلی اردو اخبار میں زیادہ تر خبریں مولوی محمد باقر کی پلانٹ کی ہوئی ہوتی تھیں۔یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے کہ مولوی باقر نے 15 جون 1847 کو مرزا غالب کی گرفتاری پر کتنی تضحیک آمیز خبر شائع کی۔بقول عتیق احمد دہلی اردو اخبار کی خبر کا آخری حصہ انتہائی پست اور رکیک ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔(8)

حالانکہ اس میں ان کا کیا قصور انہیں کیا معلوم کہ ڈیڑھ سو سال بعد جب قاری اس خبر کو پڑھ کر اس کا محاسبہ کرے گا تو اسے کتنی شرم آئے گی۔ مولوی باقر کا اخبار لکھتا ہے۔

''یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین خاں قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبیہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی وسفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کر کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپئے نہ ادا کریں تو چار مہینے قید۔ دیانت کو تو کام فرمایا انہوں نے لیکن اس علاقے میں بہت رشتے دار متمول اس رئیس کے ہیں کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پھٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانے دار کو چاہئے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے(9)۔''

مرزا غالب کے حوالے سے دہلی اردو اخبار کا جو بھی رویہ رہا ہو۔ اسی زمانے میں دہلی سے نکلنے والے 'احسن الاخبار' کے ایڈیٹر نے مرزا غالب کی گرفتاری اور رہائی کے متعلق دو خبریں شائع کیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ پہلی 25 جون 1847 کے احسن الاخبار میں شائع ہوئی۔

''مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کی باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی بھی لکھی گئی ہے۔ ان کو رہا کر دیا جائے کہ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ اسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔''

اس نوعیت کی دوسری خبر احسن الاخبار میں 2 جولائی 1847 کو شائع ہوئی ہے۔

''مرزا اسد اللہ غالب کا عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا' اس کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت کی اور دوسو روپئے جرمانے کی سزا ہوئی ہے۔ اگر دوسو روپئے جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے

قید اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپئے زیادہ ادا کئے جائیں تو مشقت معاف ہوسکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت اور مشقت برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔''

صرف دہلی گزٹ اور دہلی اردو اخبار میں شائع خبروں سے ہی دلی کی دو طرح کی شبیہ نہیں دکھائی دیتی بلکہ 1850 کی خوبصورت سجی سنوری اور اپنے تہذیبی اور تمدنی اقدار کے عروج پر کھڑی عظیم دلی حقیقتاً انگریز اور ہندوستانیوں کے درمیان دو خانوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ جب صبح صادق کے وقت انگریزوں کی چھاؤنی میں فوجی مشق کے لئے بگل بجتا تو اسی وقت لال قلعہ کا مشاعرہ اپنے شباب پر ہوتا اور چاوڑی بازار کی طوائفیں اپنا رقص بند کر کے کوٹھے پر روشن شمع دانوں کو بجھانے کی تیاری میں مصروف ہوتیں۔ ایک طرف نوجوان طوائفیں اور معشوقائیں اپنے محبوب کے پہلو کو گرم کرنے کے لئے حجرے کا رخ کر رہی ہوتیں تو دوسری طرف چھاؤنی کے فوجی اپنی داڑھی کا شیو بنا کر اپنے دانت صاف کر کے جلدی جلدی فوجی ڈریس پہن رہے ہوتے۔ وہ اپنے پاؤں میں لمبی جرابیں پہنتے اور تیزی سے پریڈ گراونڈ کی طرف بھاگتے۔ انگریز حسینائیں بھی اس ہنگامے میں اپنے بستروں سے اٹھ کھڑی ہوتیں اور گھڑ سواری پر جانے کی تیاری کرنے لگتیں۔ کچھ عورتیں چہل قدمی کے لئے بھی نکلتیں۔ ان دنوں انگریز سوسائٹی میں سورج نکلنے کے بعد عورتوں کی گھڑ سواری اور چہل قدمی کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جب دو گھنٹے بعد چھاؤنی میں فوجی اپنا پریڈ ختم کر رہے ہوتے تو دلی میں شعرا، طوائفیں اور ان کے عاشق اپنی نیند پوری کرنے کے لئے اپنے بستروں کا رخ کر رہے ہوتے۔

لیکن ان سب کے درمیان جب انگریز پاؤ روٹی مکھن اور بھنے ہوئے مرغ کے ساتھ اپنے ناشتے کی تیاری میں مصروف ہوتے تو غریب ہندوستانی، محنت کش عوام سورج نکلنے کے بعد اٹھ کر کام کی تلاش میں نکلنے کی تیاری کر رہے ہوتے۔ دھوبی جمنا کے گھاٹوں کی طرف رخ کر رہے ہوتے۔ راج گھاٹ پر دھوبیوں کا مجمع بڑھنے سے قبل ہندو عقیدت مند ان گھاٹوں پر اشنان کر کے مندروں میں پوجا کرنے چلے جاتے۔ راج گھاٹ کے کنارے مندروں میں اونچی آواز میں مختلف طرح کے سنسکرت کے اشلوک پڑھنے کی دلکش آوازیں سنائی دیتیں اور کئی طرح کے گھنٹوں کی سریلی آوازیں دل کو موہ لیتیں۔ ٹھیک اسی وقت چڑی مار شکاری قدم شریف کے علاقے میں پرندوں کو پکڑنے کے لئے جال بچھا کر اس میں جو کے دانے ڈال رہے ہوتے تا کہ خوراک کی تلاش میں آنے والے پرندے ان کی جال میں پھنس جائیں۔ دوآبہ کی طرف سے آنے والے پھل فروش، غلہ فروش، دودھ دہی والے کسان پیدل اور بیل گاڑیوں سے اپنے سامان فروخت کرنے کے لئے سبزی منڈی کا رخ کر رہے ہوتے۔

صبح صادق کے بعد جب جامع مسجد، فتح پوری مسجد، زینت المساجد، کشمیری گیٹ کٹڑے والی مسجدوں سے اذان کی دل کو چھو لینے والی مترنم آوازیں گونجتیں تو عام مسلم گھرانوں میں لوگ اپنے بستروں سے اٹھ جاتے۔ لوگ بہت تیزی سے وضو بنا کر مسجدوں کا رخ کرتے۔ اس درمیان نوکر اٹھ کر اپنا کام شروع کر دیتے۔ خس کی چکیں اٹھا دی جاتیں تا کہ پائیں باغ میں فواروں اور خوبصورت پھولوں کا نظارہ کیا جا سکے۔ زیادہ تر خوشحال گھرانوں میں ناشتے کی تیاری شروع ہو جاتی۔ پیاز، ادرک لہسن کاٹے جانے لگتے۔ عورتیں شب خوابی کا لباس تبدیل کرتیں اور بچے مدرسے جانے کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔ 9 بجے جب انگریز تیار ہو کر اپنے دفتروں کا رخ کرتے اس کے دو گھنٹے بعد چاندنی چوک اور مٹیا محل کے دوکاندار اپنی دوکانیں کھولنے کے لئے دکھائی دیتے۔ جتنی دیر میں ان علاقوں میں چہل پہل بڑھتی اس وقت تک انگریز اپنا دن بھر کا کام ختم کر کے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہوتے۔ روزانہ چاندنی چوک کا

دلی بینک صبح 9 بجے کھل جاتا مگر اس میں پہلا ہندوستانی گاہک صبح 11 بجے سے قبل کبھی داخل نہیں ہوتا۔ یہ تھا 1850 کے دلی کا ایک منظر نامہ جس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کیسے ایک زندہ شہر میں دو تہذیبیں پھل پھول رہی تھیں۔(10)

عظیم بغاوت کے اسباب:

1857 کی بغاوت پھیلنے کی ایک وجہ چربی کا کارتوس ضرور ہوسکتی ہے۔مگر ایک بڑی وجہ انگریزوں کا وہ مذہبی جنون بھی تھا جس کے لئے پورے ملک میں مشنریاں اور پادری بدنام ہو رہے تھے۔واقعہ ہے کہ 1840 اور 1850 کے درمیان یورپ سے آنے والے کچھ انتہائی جنونی مشنریوں اور پادریوں نے ہندوستان میں تبدیلی مذہب پر کام کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کو قائل کرنا شروع کر دیا تھا۔تبدیلی مذہب پر کام کرنے کی شروعات 1800 میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ہی سے ہو چکی تھی جس کے اثرات اب نمایاں ہونے لگے تھے۔ پیشاور کا کمیشنر ہربرٹ بنجامن ایڈورڈز 1819-1868 Herbert Benjamin Edwardes جس نے بہت یقینی طور پر لکھا کہ انگلینڈ کو یہ پوری سلطنت ہی اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ وہ 'پروٹسٹنٹ' ہیں۔وہ بہت جنونی قسم کا منتظم اور سخت گیر پادری تھا۔پہلی انگریز سکھ جنگ میں اس کی انتہائی ظالمانہ کامیابی کے لئے اسے ملتان کا ہیرو بھی کہا جاتا ہے۔''اس کا کہنا تھا کہ سلطنت دینے والا خدا ہی ہے اور یہ کہ انگریزوں کو یہ اس لئے عطا کی گئی ہے کہ انہوں نے عیسائی مذہب کی حقیقی روح کو محفوظ رکھا۔وہ یہ بھی کہتا تھا کہ عیسائیت کو پھیلانے کی جتنی کوششیں انگریزی سرکار کرے گی ان کی سلطنت دن دونی بڑھتی ہی چلی جائے گی (11)۔'

بغاوت کی ایک وجہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد کی تقرری نہ ہونا بھی ہوسکتی ہے۔1856 میں ولی عہد مرزا فتح الملک بہادر کی ناگہانی وفات کے بعد انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ اب نیا ولی عہد مقرر نہیں کیا جائے گا اور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے انگریزی عملداری میں ملالیا جائے گا۔لارڈ کیننگ کو یہ پتہ نہیں تھا کہ بادشاہ ظفر کو معزول کرنے کے فیصلے کا

کتنا خطرناک اثر ہوسکتا ہے۔ وہ صرف 6 ماہ قبل ہندوستان آیا تھا۔ کلکتے سے بہت دور ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں میں اس خبر کو بہت برے انداز میں قبول کیا گیا۔اس کا یہ فیصلہ اس کے ہندوستانی رعایا کے جذبات سے بالکل مختلف تھا۔انگریز ان خطرات کونہیں بھانپ سکے جوان کے آس پاس منڈلا رہے تھےاور نہ ہی ان کا سہی اندازہ لگا سکے۔ان کا تفخراور غرور حکمرانی نے ان کوملک کے صحیح حالات سمجھنےاوراس کے متعلق کوئی معلومات حاصل کرنے کی خواہش کوختم کر دیا تھا(12)۔

فروری 1856 میں جس بد بختانہ طریقے سے لکھنؤ کی ہردلعزیز ریاست پر غاصبانہ قبضہ کیا گیا تھااس سے بھی شمالی ہندوستان کے عوام میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ جوالامکھی اندر اندر ابل رہی تھی اور مولوی محمد باقر کے طنزیہ لفظوں میں دیکھا جائے تو بہت ہی حکمت عملی اور جرأت مندی میں ماہرانگریز ان بھڑکتے ہوئے شعلوں سے بالکل بے خبر تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی لارڈ ڈلہوزی کے زمانے سے ہی دیسی ریاستوں کوختم کرنے کا کام شروع کر چکی تھی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے درجنوں ریاستوں کولارڈ ڈلہوزی کی پالیسی کے مطابق ختم کیا جاچکا تھاجس کا ملک میں بہت برا اثر پڑا۔ان تمام معزول ریاستوں کے راجہ اورنواب سخت ناراض تھے۔ جب پورے ملک میں ایک ساتھ انقلاب شروع ہوگیا اور سپاہیان ہند نے انگریزوں کوتباہی کے دہانے پر پہنچادیا تو مولوی باقر بھی انگریزوں کوطنز کرنے سے بازنہیں آئے۔وہ 31 مئی 1857 کے شمارے میں کہتے ہیں ’’اب کہاں ہیں انگلش مین اور فرینڈز آف انڈیا۔۔۔اور وہ لنترانیاں حکمت اورحکومت داناؤں انگلستانیوں کی اب دیکھیں کہ شہر دیہات ہندوستان کے بے جرأتوں اورنادانوں نے اور بےعزموں اور بے بندوبستوں نے ان کے اہل حکمت واہل جرأت صاحبان عزم وانتظام کوکس نوبت پر پہنچایا۔‘‘

اگرایک جملے میں 1857 کی پہلی جنگ آزادی کو بیان کرنا ہوتو کہا جا سکتا ہے کہ ’یہ ایک بے ڈنڈے کی فوج تھی جن میں شریک مختلف طرح کی ٹکڑیوں کے مقاصد مختلف تھے۔‘اگر رتج ridge پر بہت معمولی تعداد میں موجود انگریز فوجیوں کو ہندوستانی سپاہیوں نے بھگا دیا ہوتا

تو اس جنگ کی صورت حال مختلف ہوتی۔ انگریز روزانہ اس لڑائی میں ہار رہے تھے۔ ٹھیک اسی طرح ہندوستانی سپاہی روز نئے سرے سے بددل ہو رہے تھے۔ انہیں انگریزوں کو شکست نہ دے پانے کی مسلسل ناکامی نے مایوس کر دیا تھا۔ کاش ہندوستانی فوج کو یہ معلوم ہوتا کہ ریج پر موجود مٹھی بھر انگریز کتنے دردناک کرب اور ناکامی سے گزر رہے تھے۔ لیکن ہندوستانی فوج کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ جاسوسی کا وہ جال تھا جو سپاہ ہند اور قلعہ کے اندر تک انگریزوں نے پھیلا رکھا تھا۔ ہر وہ شخص جو انگریزوں کی جاسوسی میں سپاہ ہند کی رپورٹیں انگریزوں تک پہنچا رہا تھا وہ چت اور پٹ دونوں طرح اپنی فتح یقینی بنانا چاہتا تھا۔ اگر انگریز جیت گئے تو انہیں ان کی کارکردگی کا انعام ضرور ملے گا اور ہندوستانی سپاہ کامیاب ہوئے تو وہ بڑے عہدے پر فائز تھے ہی۔ وہ فوج کیسے جیت سکتی ہے جس کے کمانڈر کی بیوی جاسوس ہو، وزیر اعظم جاسوس ہو، دیوان اور خزانچی جاسوس ہو۔ اس کے علاوہ قلعہ سے بہت سے قرابت دار انگریزوں کی جاسوسی میں ملوث تھے۔

دہلی اور اطراف دہلی میں انگریزوں کے جاسوسوں کی تعداد تقریباً 500 تھی۔ مگر ان میں خاص طور سے ملکہ زینت محل، وزیر اعظم حکیم احسن اللہ خاں، وزیر مرزا الٰہی بخش، قلعے کا خاص محافظ خواجہ سرا محبوب علی خاں کے نام شامل تھے۔ شہنشاہ ظفر کا داروغہ بارود اور ان کا مقرب خاص مولوی رجب علی وہ اہم جاسوس تھا، جسے بعد میں انگریزوں نے خان بہادر ارسطو جاہ کے خطاب کے ساتھ ہی جگراؤں کی جاگیر بھی دی (13)۔

اپنے موٹاپے کے لئے مشہور ریزیڈنسی کا میر منشی جیون لال دلی میں موجود جاسوسوں کا سرغنہ تھا (14)۔

منشی جیون لال اپنی سنگ مرمر کی سفید حویلی کے تہہ خانے میں بیٹھ کر جاسوسوں کی رپورٹوں کو ایڈٹ کر کے انگریزوں کے پاس بھیجتا تھا۔ ہندوستانی سپاہ کے کمانڈر مرزا مغل کو اس کی جانکاری ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کی حویلی پر چھاپہ مار کر اسے لوٹ لیا۔ مگر وہ تہہ خانے میں موجود منشی جیون لال تک نہیں پہنچ سکے۔

عظیم بغاوت میں مولوی محمد باقر کا رول:

مولوی محمد باقر بہت بے باک اور دلیر صحافی تھے۔ وہ اس عظیم بغاوت میں ہندوستانی سپاہیوں کا کھل کر ساتھ دے رہے تھے۔ ہندوستانی سپاہ کی ابتدائی کامیابیوں سے مولانا کا مزاج بالکل بدل گیا تھا۔ان کے اندر انگریزوں کی دوستی کا جذبہ یکسر معدوم ہو گیا۔ان کے دل کے نہاں خانے سے وہ خواہشات باہر آکر مچلنے لگیں جس میں ملک کو انگریزوں کی ناپاک ذات سے پاک کرانے کی مہم انگڑائیاں لے رہی تھیں۔انہیں اللہ کی نصرت اور غیبی امداد کے تعلق سے بہت گہرا یقین ہو چکا تھا۔مگر انہوں نے آخر تک ان حقائق کا اعتراف نہیں کیا کہ جنگیں تکنیکی برتری اور ایمانداری سے جیتی جاتی ہیں۔جنگوں کی برتری اور کامیابی میں دعاؤں اور کرامتوں کا صرف اتنا ہی دخل ہے کہ اگر سپاہی محاذ پر جاں بازی سے ڈٹے ہوئے ہیں تو ان پر اللہ کی نصرت یقینی ہے۔

یہ انگریزوں کی خوش قسمتی ہی تھی کہ جنگ آزادی کے دوران ہندو مسلمانوں کے درمیان تیزی سے منافرت پھیلنے لگی۔گائے کا ذبیحہ، جہاد اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام جیسے جملے ہندوؤں کے دلوں میں مخاصمت کا باعث بن رہے تھے۔اگست 1857 میں جب جنگ آزادی کی یہ لڑائی ہاری جارہی تھی علما اور رضا کار مسلم سپاہیوں نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی سخت ممانعت کے باوجود گائے کی قربانی کرنے کی ضد شروع کردی۔وہ کسی قیمت پر بادشاہ کے گائے کے ذبیحے کی ممانعت کا حکم ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔جیسا کہ مولوی باقر نے 28 جولائی 1857 کو لکھا ''ٹونک سے آئے ہوئے غازی اس پر اڑے ہوئے تھے کہ وہ جامع مسجد کے سامنے کھلے میدان میں عید کے دن گائے کی قربانی کریں گے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندوؤں نے اس کی مخالفت کی تو وہ انہیں بھی مار ڈالیں گے اور ہندوؤں سے حساب چکانے کے بعد وہ فرنگیوں کو ختم کر دیں گے۔ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم کو مذہب کے لئے شہید ہونا ہے تو ہم کو شہادت کا درجہ ایک ہندو کو مار کر بھی اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے، جیسا کہ ایک فرنگی کو مار کر (15)۔''

اس سے دس دن قبل ہندو سپاہیوں نے پانچ مسلم قصائیوں کو گائے ذبح کرنے کے الزام میں مار ڈالا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو صرف یہ دکھ تھا کہ ان جنونی مجاہدین نے اس قومی ہم آہنگی اور ہندو مسلم یکجہتی کی کاشت کو تباہ کر دیا تھا جسے ان کے اجداد نے صدیوں میں بڑی محنت سے تیار کی تھی۔ آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ اگر کسی نے گائے کی قربانی کی تو اسے توپ سے اڑا دیا جائے گا۔اس خبر کو ایک جاسوس رام جی داس شیر دل سنگھ علی پور نے 19 جولائی 1857 کو اپنی رپورٹ میں کچھ یوں لکھتا ہے۔ ''گاؤکشی ہوئی تھی۔ سات آدمی مارے گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا ہے جو گائے کشی کرے گا توپ سے اڑا دیا جائے گا۔سکھوں نے اور تلنگوں نے بندوق رکھ دی ہے کہ اگر گائے کشی ہوگی تو ہم نہیں لڑیں گے اور بادشاہ نے حکم دیا۔قصائیوں کو پہرے میں رکھو۔کسی نے نہیں مانا اور اس کو مار ڈالا۔حکم تلنگوں کا ہے بادشاہ کی کوئی نہیں سنتا۔ادھر غدر ہو رہا ہے۔دہلی شہر برباد ہو گیا۔''(16)

اعلان جہاد کے بعد عظیم بغاوت کا کمزور ہونا

جہاد اور اسلامی حکومت کے قیام جیسے اچھلتے ہوئے جملوں نے ہندو سپاہ کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذات کے ہندو شہریوں کے دلوں میں بھی خوف کا اضافہ کیا۔ ہندو سپاہ میں بھی زیادہ تر اعلیٰ ذات کے برہمن تھے۔ اس معاملے میں دہلی اردو اخبار نے متوازن رویہ اختیار کرتے ہوئے دونوں کے اتحاد کو وقت کی ضرورت بتایا۔ مولوی محمد باقر نے جیسے ہی دیکھا کہ ہندو مسلم منافرت سے حالات بے قابو ہوئے جا رہے ہیں تو 31 مئی 1857 کے شمارے میں اخبار نے اتحاد کے حوالے سے کسی نامعلوم مولوی صاحب کی تقریر کی رپورٹنگ کی۔ یہ تقریر کسی نامعلوم مولوی صاحب کے حوالے سے ضرور تھی مگر ان میں ظاہر کئے گئے خیال وفکر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولوی محمد باقر کے خود کی تحریر تھی۔ اس رپورٹ میں ہندوستان کے تمام رئیسوں، جاگیرداروں اور راجاؤں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ وقت کا تقاضہ سمجھیں اور اتحاد اور یکجہتی کا ساتھ دیں۔ اگر ان انگریزوں کے دھوکے میں آ گئے تو ملک کے ہندو و مسلمان سب ایک دن افسوس

کریں گے۔ 14 جون 1857 کے شمارے میں اخبار لکھتا ہے۔ ''ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے مذہبی اختلافات ختم کر دینے چاہئیں، کیوں کہ جہاں سلطنت کا زوال پاؤ گے وہاں تنازعات مذہبی رعایا کو پاؤ گے۔''

جنگ آزادی کے متوالے ہندو مسلمان بہت جانبازی سے نبرد آزما تھے۔ اس جنگ میں اگر علما نے اپنے مذہبی جوش کو شامل نہیں کیا ہوتا تو شاید لڑائی کا رخ بہتر ہوتا۔ یہی وہ وقت تھا جب علماء نے جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ یکم مارچ کو شاہ جہاں پور میں سب سے پہلے مولوی سرفراز علی نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ فتوے کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

''استفتا۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ انگریز دہلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کے جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان پر بھی جہاد فرض ہے یا نہیں؟ بیان کریں۔

جواب۔ درصورت مرقومہ فرض عین ہے۔ اوپر اس شہر کے تمام لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے اور یہ بہ سبب کثرت اجماع افواج کے اور مہیا کر اور موجودہ ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا؟ اور اطراف وحول کے لوگوں پر جو دور ہیں، باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ عاجز ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا۔ (17)

مفتی صدرالدین آزردہ جیسے قابل اور جہاں دیدہ عالم نے مجاہدین کی ایک نجی فوج بنا لی اور اپنے ہاتھ پر بیعت کرائی۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے انگریزوں سے بہت گہرے مراسم تھے اور ان کے بارے میں سرسید کا خیال تھا ''عقل مندوں میں سب سے عقل مند'' تھے۔ وہ ارسطو کی مہارت کو آسمان سے زمین کی خاک میں ملانے والے دانشور تھے۔ وہ ایک شاعر اور

بزم شعراء کے سرتاج تھے۔ لال قلعہ اور ریزیڈنسی دونوں میں کامیابی سے ثالث کا رول نبھانے والے نہایت قابل عزت شخصیت کے مالک تھے آزردہ۔ انہوں نے بھی جہاد کی حمایت کی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، سید کفایت علی کافی، مولانا لیاقت الہ آبادی اور مولانا احمد اللہ مدراسی کے علاوہ بڑی تعداد میں علماء اور فضلاء اس انقلاب میں کود پڑے۔

سر سید کے لفظوں میں ''تحریک جہاد نے اس دور کے اکثر دانشوروں، شاعروں اور علما ومشائخ کو متاثر کیا (18)۔''

علما نے اس بغاوت کے ذریعے انگریزوں کو ملک سے بھگانے کے ایک سنہرے موقع کے طور پر دیکھا۔ مگر ان کی کم عقلی اور مذہبی جوش جنون نے ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت کی جو دیوار کھڑی کر دی اور اس منافرت نے اتنے بڑے انقلاب کو بے اثر کر دیا۔ ان کی ناقص حکمت عملی نے سب کچھ ختم کر دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ علما کی جانب سے جہاد کا فتویٰ دئے جانے سے قبل جنگ آزادی کی اس رضا کارانہ خود سپردگی میں مسلمانوں کی حصے داری نہیں تھی۔ اس فتوے سے قبل بھی بڑی تعداد میں مسلم سپاہ اس جنگ میں شریک تھے۔ فتوے کے بعد مسلم رضا کار بڑھے ہوں سکتے ہیں مگر اس نے معاملے کو بہت خراب کر دیا۔ انگریزوں کو سکھوں، جاٹوں اور راجپوتوں کو یہ باور کرانے کا موقع مل گیا کہ ہمارے جاتے ہی یہاں اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی اور تم ایک اسلامی حکومت کے زیر اثر ہو گے۔ غالباً راجپوتانے میں زیادہ تر ریاستیں اسی خوف سے شریک جنگ نہیں ہوئیں۔ سکھ قوم کی بڑی آبادی نے جنگ آزادی کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ سپاہیانہ طور پر دوبارہ انگریزوں کے ساتھ مل کر دہلی پر یورش کی اور انگریزوں سے زیادہ سختی سے دلی والوں سے نپٹنے کی ہمت دکھائی۔

جہاد اور اسلامی حکومت کے قیام جیسے احمقانہ فیصلے کو اس زمانے میں صرف ایک آدمی سمجھ سکا اور وہ تھا سر سید احمد خاں جس نے علما کے فتوے کو پوری طرح خارج کر دیا اور اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں لکھا کہ آنے والے دنوں میں اس کا کتنا خراب اثر ہندوستان پر پڑے

گا۔سرسید بہت واضح انداز میں لکھتے ہیں۔ یہاں فتویٰ کے متعلق ان کے دعوے کو ہو بہو نقل کرنا ضروری ہے۔

’’دلی میں جو جہاد کا فتویٰ چھپا وہ ایک عمدہ دلیل جہاد سمجھی جاتی ہے۔مگر میں تحقیق سنا ہے اوراس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلی میں گئی تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہوسکتا اگرچہ اس سے پہلے فتویٰ کی میں نے نقل دیکھی ہے مگر جب کہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے۔مگر جب بریلی کی فوج دلی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے بلا شبہ اصلی نہیں چھاپنے والے اس فتویٰ نے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں نے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دی تھی بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔(19)۔‘‘

کرامتوں کا انتظار

جنگ آزادی کی اس پہلی لڑائی کو جہاد کا نام دینے والے صحافی مولوی محمد باقر بہت حوصلہ اور جذباتی انداز میں 11 مئی کی واردات اور واقعات کو پیش کرتے ہیں۔انہوں نے دن بھر تیزی کے ساتھ شہر کی گلیوں میں دوڑ کر رپورٹنگ کی۔دو سو سال قبل اسپاٹ رپورٹنگ کی وہ انوکھی مثال تھی۔انہوں نے 17 مئی کو بہت قیمتی شمارہ نکالا۔ جنگ آزادی کی اس لڑائی میں دہلی اردو اخبار کے اس شمارے کی چشم دید رپورٹنگ کی تاریخی حیثیت ہے۔انہوں نے بہت سرعت سے انگریزوں کی شکست پر انہیں خدا کی ناراضگی سے جوڑ دیا کہ یہ دیکھ کر حیرانی سے دل بوجھل ہو جاتا ہے۔ان کی رپورٹنگ میں کرامتوں کی بھی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔انہوں نے خبروں

میں حوالوں کے لئے' کہا جاتا ہے' سنا جاتا ہے جیسے جملے استعمال کرتے ہوئے مجاہدین کی حوصلہ افزائی کے لئے غیر حقیقی، کراماتی و برکاتی، قومی اپیلیں، دلیلیں اور بزرگوں کے اقوال اور شرعی اقوال جیسی خبروں کو وسیع پیمانے پر پلانٹ کیا۔ایک اعتدال پسندانہ صحافی کے برعکس وہ خود بھی جنگی تجزیہ کرنے لگے۔ان کی خبروں کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ خود بھی ایک فریق ہیں۔صرف مولوی باقر ہی نہیں بلکہ انگریزوں میں بھی کچھ افراد ایسے تھے جو خدائی مدد کی امید لگائے ہوئے تھے اور انہیں بھی خدائی کرامتوں پر یقین تھا۔ایک انگریز جرنل ایڈورڈ کیمپ ویل جورج پر تعینات تھا اپنی بیوی کو لکھتا ہے۔''وہ خدا ہی ہے جو ہماری مدد کرے گا۔اصلی امن وسکون اس کی مدد میں پوشیدہ ہے۔مجھے بھروسہ ہے کہ خدا کا سایہ ہمارے سر پر ہے۔اور وہ ہمیشہ اپنا فرض ایمانداری اور بہادری سے پورا کرنے کی طاقت دے گا۔مجھے یہاں کے دوسرے فوجیوں کی طرح مرے ہوئے باغیوں کی تعداد دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی ہے۔وہ بھی خداوند کے بنائے انسان ہیں۔''(20)

ایک رپورٹ میں مولوی محمد باقر لکھتے ہیں۔''اے سپاہ دلیرا ے تلنگان! بیشتر تاریخوں میں جس طرح سلطنت ہائے سابقہ میں کارنامہ ہائے شجاعان زماں گزشتہ یادگار ہیں کہ تاریخ قدیمہ ہند میں خاندان یدوونشی میں بھیم وارجن وغیرہ بہادری میں یادگار ہیں اور اعلیٰ ہذالقیاس تواریخ فارسی میں شجاعت رستم و سام اور سلطنت اہل اسلام میں فتوحات حضرت صاحب قراں امیر تیمور گاں اور دلیرانہ فوج چنگیز خاں اور بہادران ہلاکو خاں وافواج نادریہ تواریخوں میں لکھے چلے آتے ہیں اور آخر زمانے کے لوگوں کی ہمت کو بڑھاتے ہیں اور جرأت کو ترقی دیتے ہیں۔اسی طرح یہ معرکہ تمہارا بھی تواریخوں میں لکھا جائے گا اور صفحہ عالم پر کار رستمانہ تمہارا یادگار رہے گا کہ اس بہادری اور جواں مردی سے تم نے ایسے اولوالعزم اور متکبر سلطنت کے کروفر اور غرور کو توڑا ہے اور ان کی نخوت فرعونی اور غرور شدادی کو یکسر خاک میں ملا دیا ہے۔۔۔''(21)

اسی سلسلے میں مولوی باقر کے فرزند اور اخبار کا کام دیکھنے والے ان کے لائق وفائق

صاحبزادے مولانا محمد حسین آزاد نے 'تاریخ انقلاب عبرت افزا' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں کہا گیا ہے کہ کیسے خداوند تعالیٰ نے مغرور فرنگیوں کا منہ کالا کیا اور ان کی حکمت و دانائی کو خاک میں ملا دیا۔ آزاد کی یہ نظم دہلی اردو اخبار میں 24 مئی 1857 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ ایران سے بہادر شاہ ظفر کے مطالبے پر امدادی فوج کے آنے کی فرضی رپورٹنگ اس وقت دلی سے نکلنے والے سارے اخباروں نے کی۔ دلی اردو اخبار کے 23 اگست 1857 کے شمارے میں مولوی محمد باقر لکھتے ہیں۔ ''بعض لوگ آئندگان طرف پیشاور و پنجاب بیان کرتے ہیں کہ لشکر ایران اٹک تک پہنچ گیا ہے۔ اگرچہ اس کا وثوق تصدیق ہم کو نہیں ہے لیکن بطریق گپ جو سنا گیا لکھا گیا۔ کیوں کہ ممکنات سے کچھ محال نہیں کہ بالکل کذب کا حکم قائم کیا جائے اور صرف جھوٹ تصور کیا جاوے۔ لیکن اب حال لوگوں کا یہ ہو گیا ہے کہ کسی خبر پر لوگوں کو یقین و اعتماد نہیں ہوسکتا اور تعریف خبر میں سے شق اجمال صدق، حذف کی جاوے تو بجا و زیبا ہے۔''

13 ستمبر 1857 کے شمارے میں ایرانی فوج کے دہلی آنے کی ممکنہ خبر کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ''بعض لوگ پھر کہتے ہیں کہ لشکر ایران ذرۂ یولان و بے بے نائی سے اتر آیا۔ امیر دوست محمد خاں نے بخوشی ان کو راستہ دے دیا۔ لیکن بموجب مثل مشہور ہندی کی کہ ''با من جیسی ہی پیتا وے''، یعنی بندے کو جب یقین ہو جب کچھ آثار سامنے آویں مگر اور طرح کے آثار، البتہ ایک قسم کا یقین دل کو اثر کرتا ہے کہ فوج ایران البتہ آوے آئندہ العلم للہ والحکم للہ۔'' 31 مئی 1857 کو دہلی اردو اخبار میں مولوی محمد باقر لکھتے ہیں کہ ایک دن جب وہ شہر میں خبریں جمع کرنے کی غرض سے گھوم رہے تھے انہوں نے دیکھا میگزین کے قریب ایک مولوی صاحب تقریر کر رہے ہیں۔ اس تقریر کو وہ من وعن نقل کرتے ہیں۔ ''ایک بزرگ قریب میگزین کے کہہ رہے تھے اے گروہ مسلمانو! مبارک ہو تم کو دین اسلام کی ترقی تمہیں لازم ہے کہ یقین اپنا درست رکھو خدائے تعالیٰ کی قدرت کو اور عزت کو برحق جانو قرآن میں مضمون واللہ العزت و الرسولہ (منافقون۔7) دیکھو اور عظمت نصاریٰ اور اعتقاد کلمات اور تدبیرات و زور و فریب

نصاریٰ پر تکیہ واعتماد نہ رکھو جس خداوند تعالیٰ نے ان کو ایسی مت دے جس کا آناً فاناً میں یہ نتیجہ ظاہر ہوا اور ایک ایک ادنیٰ آدمی کو یہ حوصلہ عطا کیا جس سے یہ ثمر نمایاں ہوا وہ قادر الاطلاق کیا اب ان کی رائے اور تدبیرات پر تمہیں غالب نہیں۔'' مگر یہ جوش بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔

دہلی کی تباہی

جب ہم سر سید کے اس فہم وفراست کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی کا ذہن کتنا بالغ اور وسیع تھا اور یہ کہ وہ کتنا دور تک سوچ سکتا تھا۔ سر سید نے نہایت دیانتداری کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت انگریزوں کے خلاف تصادم کا راستہ اختیار کرنا لاحاصل ہے۔ ہمیں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ سر سید کے پیش رو مرزا غالب تھے جو ٹھیک اسی فکر کے پیکر تھے اور یہ کہ ان کا ہمارے سر سید پر کتنا گہرا اثر تھا۔ اس وقت جب سر سید بجنور میں قیام پذیر تھے۔ مرزا غالب دہلی میں اپنی حویلی میں بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ کس طرح بہار اور یوپی کے یہ بے ترتیب تشدد پسند اجڈ اور غیر مہذب تلنگے ان کے خوبصورت شہر کو انتہائی بے رحمی سے تباہ وبرباد کر رہے ہیں۔ یہ سپاہی صرف انگریزوں کو ہی نہیں مار رہے تھے۔ بلکہ موقع ملتے ہی شریف اور مہذب لوگوں کے گھروں کو بھی لوٹ لیتے اور شریف عورتوں کو پریشان کرتے۔ دلی شہر بدنظمی، غنڈہ گردی اور لوٹ مار کا سینٹر بن چکا تھا۔ جس کی تفصیل مرزا غالب کی تاریخی دستاویز 'دستنبو' اور مولوی محمد باقر کی بعد کی اخباری رپورٹوں میں واضح طور پر درج ہے۔ غالب اپنی حسین اور پیاری دلی کی تباہی پر ماتم کناں تھے۔ وہ اس دلی کو زندہ رکھنا چاہتے تھے، جہاں انگریزوں کے ساتھ ہندو اور مسلمان سبھی خوش وخرم رہائش پذیر تھے۔ یہ لوگ ایک طرح کی ریختہ بولتے تھے اور ان کی تہذیب تقریباً ایک جیسی تھی۔ یہ غالب کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ دلی تھی ہی ویسی۔ دہلی ہمیشہ احساس اعلیٰ ظرفی Complex Superiorty کی شکار رہی ہے۔

دنیا کا سب سے بہترین شہر دہلی، خوبصورت عورتوں والا شہر دہلی، نفیس اور خالص اردو

بولے جانے والا شہر دہلی، وہ عظیم دہلی جہاں لال قلعہ اور جامع مسجد ہے اور مٹیا محل، گلی بلاقی بیگم اور سیتارام بازار واقع ہے۔ ان گلیوں اور کوچوں میں بسنے والے لوگوں کی انانیت اپنے عروج پر تھی۔ یہ انانیت زبان دانی اور تہذیبی اقدار سے آگے بڑھ چکی تھی۔ یہ وہی انا پرستی تھی جس نے دبستان دلی لکھوائی اور اس نے یہ ثابت کیا کہ اردو شاعری میں میر، غالب اور مومن ہی اچھے شاعر ہیں۔ پٹنہ کے شاد عظیم آبادی کا کوئی معیار نہیں ہے اور آگرے کے نظیرا کبرآبادی صرف غیر مہذب گویا ہیں۔ ایک ایسی فضا بنائی گئی، ایک ایسا ذہن تیار کیا گیا، جس میں یہ بات ابھر کر سامنے آئی کہ ''جس نے دہلی نہیں دیکھی یا جو دہلی میں نہیں رہا وہ زبان داں نہیں ہوسکتا۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں دبستان زبان تھیں اور قلعہ معلیٰ کی زبان فصاحت کی جان تھی (22)۔''

صرف غالب ہی نہیں بلکہ پوری دلی باہر سے آنے والے سپاہیوں کو پوربیے اور جاہل تلنگا کہتی تھی۔ تلنگا بمعنی اجڈ گنوار لٹیرے ایک ایسا ہتک آمیز لفظ تھا جو اپنے ہی ملک کے دوسرے خطے کے شہریوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ تلنگا دلی کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ ان کی زبان اور رہن سہن بھی مختلف تھا۔ غالب دستنبو میں لکھتے ہیں۔

> ''شہر حاکموں سے خالی اور بندہ ہائے بے خدا وند سے بھرا ہوا۔ جیسے باغ باغباں سے خالی اور درختان بے ثمر سے پر ہو لٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد۔ گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات خوان مفت کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گمنامی کے گوشے میں چھپے ہوئے تھے وہ گروہ در گروہ خنجر بکف اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں (23)۔''

''وہ کم رتبہ لوگ سارا دن مٹی بیچنے کے لئے زمین کھودتے تھے ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں آتش گل سے چراغ روشن رہتے تھے اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔ نازنینان شہر کا زیور بزدل اور سیہ کار رہزنوں

کے قبضے میں ہے۔ ان بے سروپا لوگوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ ان کی حرکات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکر کھاتے پھر رہے ہیں اور چھچھورے ہر وقت اس طرح ناز و خود نمائی میں محو ہیں۔ گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے بہے چلے جا رہے ہیں، بڑے بڑے عالموں اور ناموروں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت وہ بے اندازہ زر و جواہر و عزت و آبرو کے مالک ہیں۔ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے(24)۔

دہلی اردو اخبار کے 17 مئی کے تاریخی شمارے میں مولوی محمد باقر نے باہر سے آنے والے ان سپاہ کا ''اے سپاہ دلیر۔ اے سپاہ تلنگان'' جیسے الفاظ کا استعمال کر کے خیر مقدم کیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی ہفتے کے اخبار میں انہوں نے جو خبر لکھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں سے بہت جلدی تنگ آ گئے تھے۔ 24 مئی 1857 کے شمارے میں انہوں نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔

> ''ساری رعایا اس لوٹ مار سے تنگ آ چکی ہے۔ شہر کے رئیسوں اور امیروں کے لئے سخت خطرہ ہے اور پورا شہر تباہ ہو رہا ہے۔''

جب کہ وہ 23 اگست 1857 کے شمارے میں بہاری گنواروں کی کاہلی کی زبردست شکایت کرتے ہیں۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ ان سپاہیوں نے طوائفوں کے کوٹھوں کو ہتھیا لیا ہے۔ دلی آنے والے سپاہیوں کے متعلق ان کے خیالات زیادہ مایوس کن ہیں۔

> ''جیسے ہی وہ دلی کا پانی پیتے ہیں یا چاندنی چوک کا ایک چکر لگا لیتے ہیں اور جامع مسجد جا کر گھنٹے والے کی مٹھائی کھا لیتے ہیں، ان کا دشمنوں کو مارنے اور ان سے لڑنے کا سارا جوش اور جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ ان کی ساری ہمت اور حوصلہ ختم ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ جنگ پر طوائفوں کے

کوٹھے سے بغیر غسل کیے پہنچ جاتے ہیں اور یہ سب شکست جوان کو ملی ہے اور آفت جو ہم سب پر آئی ہے، اسی حقیر عادت اور بدکاری کا نتیجہ ہے۔''

لیکن غالب کا دل پر سکون ہونے والا نہیں تھا۔ پانچ ماہ بعد جب 14 ستمبر کو انگریز دوبارہ دلی واپس آنے لگے تو انگریزوں کی ظلم و زیادتی سے ان کا دل مزید رنج و الم میں مبتلا ہو گیا۔ کیوں کہ دلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے ان کی پیاری دلی کو جس بے دردی سے لوٹا اور قتل عام کیا وہ تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ غالب لکھتے ہیں۔

''آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب۔''

مرزا غالب اس قتل عام میں اپنے دوستوں کے مارے جانے کی طویل لسٹ پیش کرتے ہیں۔

''ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو
اس کو زیست کیوں نہ دشوار ہو۔''

اسی طرح دلی کے مکانات اور عمارتوں کو جو انگریزوں نے نقصان پہنچایا اس کی تفصیل بھی بہت غمناک ہے۔

''مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بہ مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ انیٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکاں ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا، اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا ہے۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بیوی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔''

انہوں نے دلی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی بربادی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس تفصیل میں انہوں نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

''او میاں سید زادۂ آزادۂ دلی کے عاشق دل دادہ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و

آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود، مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی (25)۔"

صلح و آشتی کی کوششیں

اگست کے آخر میں جب ریج پر انگریزوں کی کمک پہنچنے لگی اور ہندوستانی سپاہ انہیں کھدیڑنے میں ناکام ہو گئے تو انگریزوں کے سب سے بڑا جاسوس مولوی رجب علی نے بادشاہ کو انگریزوں سے صلح کے لئے قائل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے مولوی محمد باقر کو بھی اپنے اعتماد میں لیا اور طے یہ ہوا کہ دہلی اردو اخبار کا ایک شمارہ اس طرح کا لکھ کر میجر ہوڈسن Major Hodson کے پاس بھیجا جائے جس میں مولوی باقر اور بادشاہ کی بے گناہی کا ذکر ہو۔ مولوی محمد باقر اور شہنشاہ ظفر کی صلح و آشتی کی ان کوششوں کو صد فی صد غداری پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ لوگ سپاہی نہیں تھے اور نہ ہی محاذ پر صف آرا تھے۔ یوں بھی جن لوگوں کو ملک سے غداری کرنی تھی وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ اب غداری اور صلح و آشتی دونوں کے لئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ پھر بھی مولوی باقر نے دہلی اردو اخبار میں ایک طویل مراسلہ لکھا اور جاسوس رجب علی کے ذریعے ریج پر میجر ہوڈسن کے پاس بھیج دیا۔ ولیم ڈیلرمپل کہتے ہیں کہ مولوی باقر نے میجر ہوڈسن سے ریج پر ملاقات بھی کی تھی۔ ہوڈسن نے مولوی باقر کو دلی میں اپنا جاسوس مقرر کر دیا تھا۔ لیکن اس نے کھلے لفظوں میں کہا کہ وہ یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ انگریزوں کے دلی پر قابض ہونے کے بعد مولوی صاحب کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ (26)

مولوی محمد باقر کا وہ مراسلہ دلی کمشنری میں آج تک محفوظ ہے۔ اس مراسلے میں مولوی باقر نے اپنی مایوسی، ناکامی اور دل شکنی کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اس مراسلے میں انہوں نے انگریزوں کے ساتھ تمام طرح کی دشواریوں کے لئے کرنل بخت خاں اور شہنشاہ ظفر کے وزیر حکیم

احسن اللہ خاں کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کو تو مولوی محمد باقر بہت پہلے سے اپنے غصے کا ہدف بناتے رہے ہیں۔ وہ اپنے اخبار میں ان کی ذاتیات پر نشانہ لگانے کا کوئی بھی موقع نہیں چھوڑتے تھے۔ قلعہ کی بدعنوانیوں اور ظفر کے فیصلوں اور خیالات میں تذبذب کے لئے وہ حکیم کو ہی مورد الزام ٹھہراتے تھے۔ حکیم کے خلاف اردو اخبار میں درجنوں خبریں شائع ہوئی ہیں۔ مولوی باقر میجر ہوڈسن کو لکھتے ہیں۔

> ''جب سے ہندوؤں نے گائے مارنے کے لئے پانچ مسلمان قصائیوں کو قتل کیا، تب سے باغی فوجوں کے ہندو اور مسلمانوں میں بہت کشیدگی پھیل گئی ہے۔ ہم لوگ جو دلی کے رہنے والے شریف شہری ہیں۔ سپاہیوں کے ظلم وزیادتی سے صبر کی آخری حد تک پہنچ چکے ہیں اور ہمیں اپنی جان بچانے کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں جنرل بخت خاں کے جاسوس میرا پیچھا کرتے ہیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے گھر پر پہرا ہے اور کسی کا بھی آنا جانا منع ہے۔ زینت محل کے ذریعے میں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ شہر کے دروازے کھول کر انگریزوں کو دعوت دیں کہ وہ آکر شہر پر قبضہ کر لیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر باغیوں کو ختم کر دیں گے تو ان کو اور ان کے بچوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ بادشاہ سلامت نے میرے مشورے کو قبول شرف بخشا اور ایسا ہی کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن حکیم احسن اللہ خاں نے انہیں میرے مشورے پر عمل کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ ہم دونوں کے عقیدے مختلف ہیں۔ حکیم سنی المسلک ہیں اور میں شیعہ ہوں (27)۔''

مولوی محمد باقر

مولوی محمد باقر 1810-1857 دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ انتہائی دیندار اور باشعور خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد مولانا اکبر بذات خود ایک مجتہد اور جلیل القدر شیعہ عالم تھے۔ مولوی محمد باقر کا سلسلہ نسب رسولؐ خدا کے معروف صحابی سلمان فارسیؓ سے

جا کر مل جاتا ہے۔ان کے اجداد ایران سے نقل مکانی کر کے کشمیر میں آباد ہو گئے تھے۔وہاں سے وہ لوگ شہنشاہ شاہ عالم کے عہد میں دہلی آئے۔شہنشاہ شاہ عالم نے مولوی باقر کے جد امجد حضرت محمد شکوہ کا دہلی میں ان کی علمی فضیلت اور دانائی کی مناسبت سے خیر مقدم کیا اور انہیں تبلیغ دین کی اجازت مرحمت فرمائی۔مولوی محمد باقر کا خاندان اپنی علم وفضیلت کی بنا پر ایران میں بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا اور دہلی میں اس نے علم وفضل میں اپنا مرتبہ قائم رکھا۔مولوی محمد باقر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔وہ بہت ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔بڑے ہونے پر انہیں سنی عالم دین عبدالرزاق قابلی کے مدرسے میں داخل کرایا گیا۔اسی مدرسے میں شیخ محمد ابراہیم ذوق بھی زیر تعلیم تھے۔مولوی باقر نے 1825 میں دہلی کالج میں داخلہ لیا۔جو اسی سال مدرسہ غازی الدین حیدر کی عمارت میں قائم ہوا تھا۔دہلی کالج سے اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد اسی کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔انہیں پڑھنے لکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ان کی لائبریری بہت زرخیز تھی۔وہ نایاب کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ان کا گھر دہلی کے درگاہ پنجہ شریف کے پاس تھا۔وہاں انہوں نے ایک امام باڑہ کی تعمیر کروائی تھی۔وہیں ایک کھجور والی مسجد تھی جو آج بھی ہے۔اسی میں مولوی باقر کے خاندان کے لوگ نماز ادا کرتے تھے۔

مولوی محمد باقر بہت بے باک اور حق گو صحافی تھے۔وہ جید عالم اور مجتہد ہونے کے ساتھ ساتھ دور اندیش، کشادہ ذہن، وسیع النظر، روادار اور باہمی احترام کا جذبہ رکھنے والے فراخ دل انسان تھے۔ان کی سب سے بڑی خدمت 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی وہ رپورٹنگ ہے جو تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور جس کے لئے انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔جنگ آزادی کے دوران وہ مسلسل دلی کی گلیوں میں گھوم کر چشم دید رپورٹنگ کر رتے رہے، جس کی وجہ سے ان کے اخبار کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔دو وجہوں سے مولوی محمد باقر اردو صحافت میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں اور ہم ان کی اہمیت وافادیت کا احترام کرنے کے لئے مجبور ہیں۔اول تو وہ اردو کے پہلے صحافی تھے جنہوں نے دہلی اردو اخبار نکالا جو تقریباً 20 برسوں تک

دلی میں اپنی پوری توانائی سے شائع ہوتا رہا۔ دوئم وہ اردو کے اولین صحافی تھے جنہیں خبروں کی رپورٹنگ کے دوران قتل کیا گیا۔ جب ہم ان خصوصیات کے ساتھ مولوی محمد باقر کی شخصیت اور ان کی کارکردگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ صف اول کے صحافی اور ادیب نظر آتے ہیں۔ دہلی اردو اخبار ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ مگر اس کے علاوہ بھی ان کی کئی معتبر کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ ان کی زیادہ تر کتابیں مذہبی نوعیت کی ہیں، جو شیعہ مسلک کی ترویج و تبلیغ کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔

مولوی محمد باقر کی گرفتاری اور سزائے موت

جب دہلی اردو اخبار کا 13 ستمبر کا شمارہ بازار میں پہنچا۔ اسی دن انگریزوں کی ایک فوجی ٹکڑی مغربی جنوبی دیوار پھاند کر دلی میں داخل ہوگئی۔ 14 ستمبر کو بھی انگریزی فوج شہر کے الگ الگ ٹھکانوں سے داخل ہو رہی تھی۔ وہ جس علاقے میں داخل ہوتے وہاں لوگوں کو وسیع پیمانے پر گرفتار اور قتل عام کر رہے تھے۔ ان کے ظلم، قتل و غارت گری سے عورتیں بچے اور نوجوان تک محفوظ نہیں تھے۔ لیکن مولوی محمد باقر کو انگریزوں کے ساتھ اپنے قدیمی تعلقات اور بے گناہی پر پورا اعتماد تھا۔ انہوں نے 13 ستمبر کو دلی میں انگریزوں کے داخلے کے بعد بالکل بھی چھپنے کی کوشش نہیں کی اور معمول کے مطابق 15 ستمبر کو اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر 19 ستمبر کا شمارہ نکالنے کی تیاری کرتے رہے۔ اسی دوران کچھ انگریز سپاہی ان کے دفتر میں دندناتے ہوئے گھس آئے اور انہیں پکڑ کر لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی وقت انگریزی فوج کا ایک دستہ مولوی محمد باقر کے گھر گیا اور ان کے فرزند مولانا محمد حسین آزاد کو ایک گھنٹے میں گھر خالی کرنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے سختی سے حکم دیا کہ اگر گھر خالی نہیں ہوا تو وہ سب کو گولی مار دیں گے۔

14 ستمبر کی اس سخت گرم دوپہر میں دلی میں قتل ہونے والے ان سینکڑوں نوجوانوں کے مقابلے محمد حسین آزاد کو زیادہ خوش قسمت تصور کیا جانا چاہئے، کیوں کہ وہ پولیس کی گولیوں سے محفوظ رہے۔ محمد حسین آزاد نے اپنے گھر کے 22 افراد کو نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچایا۔ اس

کے بعد انہیں مولوی محمد باقر کو بچانے کی فکر ہوئی۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد انہیں اپنے والد کے دوست کرنل سردار سکندر سنگھ کے ذریعے معلوم ہوا کہ مولوی باقر کو کل میدان میں پھانسی دی جائے گی۔ کرنل سکندر سنگھ ان کے والد کے ساتھ ساتھ محمد حسین کی بھی بہت عزت کرتے تھے۔ 17 ستمبر کو محمد حسین آزاد بہت احتیاط سے سکندر سنگھ کے ساتھ سائیس کے بھیس میں اس میدان میں گئے، جہاں مولوی باقر کو پھانسی ہونی تھی۔ پھانسی سے قبل تختہ دار پر چڑھتے ہوئے مولوی باقر کی نظر اپنے ہونہار 27 سالہ نوجوان بیٹے محمد حسین سے ملی اور انہوں نے بغیر کسی اشارے کے اپنا سر جھکا لیا۔ اس منظر کو محمد حسین آزاد نے بہت غم ناک نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ اس مجمع سے بہت خاموشی سے باہر نکل آئے۔(28)

بغاوت میں ہندوستانی سپاہیوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے مولوی محمد باقر سے انگریز سخت برہم تھے۔ عظیم بغاوت کے ان نو دس مہینوں میں ریج پر موجود انگریز افسران کے پاس صرف اردو اخبار اور مولوی باقر کی سرگرمیوں کی رپورٹیں پہنچ رہی تھیں۔ ان حالات میں مولوی صاحب کا فرار ہونا یا روپوش ہونا ناممکن تھا۔ ان کی تمام کارروائیاں انگریزوں کی نظروں میں تھیں۔ دلی میں موجود جاسوسوں کی ٹیم کا سربراہ مولوی رجب علی ان کی رپورٹ میجر ہوڈسن کو بھیجتا رہتا تھا۔ بادشاہ کے وزیر اعظم اور جاسوس حکیم احسن اللہ خاں سے مولوی باقر کے مراسم بہت پہلے سے خراب تھے۔ حکیم بھی مولوی باقر کے خلاف تھے، اور وہ مولوی باقر کی پھانسی کی ایک بڑی وجہ ہو سکتے ہیں۔

یہ بات کہنا کہ مولوی باقر کی پھانسی دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر جوزف ہنری ٹیلر کی جان نہ بچا پانے کی وجہ سے ہوئی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی کہانی کا اہم ترین ماخذ مولوی عبدالحق کی کتاب 'مرحوم دہلی کالج' ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جنگ کے پہلے دن جب دہلی کالج کو نذر آتش کیا گیا تو کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر بھاگ کر مولوی باقر کے گھر میں چھپ گئے تھے۔ لیکن دوسرے دن مولوی باقر نے انہیں ہندوستانی لباس پہنا کر اپنے گھر سے

باہر نکال دیا اور راستے میں ہندوستانی سپاہیوں نے انہیں پہچان کر مار ڈالا۔مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ پرنسپل مسٹر ٹیلر کی موت کی وجہ سے انگریز مولوی باقر سے ناراض تھے۔(29)

اس میں دی گئی روایت کو مالک رام اور امداد صابری کے علاوہ تقریباً ایک درجن محققین نے من وعن قبول کرتے ہوئے مولوی باقر کی شہادت کے لئے ٹیلر کی موت کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔مولوی باقر نے دہلی اردو اخبار میں مسٹر ٹیلر کے قتل کی پوری تفصیل لکھی ہے۔اس خبر کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی باقر مسٹر ٹیلر کے بہت قریب تھے۔وہ نہ صرف ان کے شب و روز کے متعلق گہری جانکاری رکھتے تھے بلکہ ان کے بینک بیلنس کے متعلق بھی معلومات تھی۔مولوی باقر کی مسٹر ٹیلر کی موت کی رپورٹنگ کے مدنظر کہا جاسکتا ہے کہ تمام انگریز مہلوکین کی طرح مسٹر ٹیلر بھی ناراض سپاہیوں کے ہتھے چڑھ گئے ہوں گے۔مولوی محمد باقر کو پھانسی دئے جانے کے بعد ان کی تدفین کہاں کی گئی اس کو انگریزوں نے راز میں رکھا۔آج تک ان کے مدفن کا پتہ نہیں چلا۔انگریزوں نے ان کی لاش کے ساتھ کیا سلوک کیا یہ بھی پردۂ راز میں ہے۔

حوالے اور نوٹس

1۔دہلی اردو اخبار 1841 از ارتضٰی کریم۔ص:11 شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی پریس نئی دہلی۔2010

2۔دہلی اردو اخبار 1841۔ص:159، 3 ۔دہلی اردو اخبار 1841۔ص:127

4۔دہلی اردو اخبار 1841۔ص:137

5۔اردو صحافت اور مولوی محمد باقر از عادل فراز۔ص:260،عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی۔2019

6۔اردو صحافت از انور علی دہلوی۔ص:89 اردو اکادمی نئی دہلی۔2013

7۔آخری مغل از ولیم ڈیلرمپل ص: 90-91 بلومس بری پبلشنگ انڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ نئی دلی۔2015۔ولیم ڈیلرمپل انگریزی کے آج کے دور کے بہت ایماندار اور مخلص ناول نگار ہیں۔مغل تاریخ پر ان کی بہت گہری پکڑ ہے۔آخری مغل ان کے انگریزی ناول The fall of dynasty, The Last MughulDelhi 1857 کا ہندی ترجمہ ہے۔ذکیہ ظہیر نے اس شاندار ناول کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔اس مقالے میں دئے گئے تمام حوالے ہندی ایڈیشن سے لئے گئے ہیں۔

8۔ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں از عتیق احمد صدیقی ص۔274

9۔دہلی اردو اخبار 1841۔ص:228

10۔1850 کی دلی کے اجمالی جائزے کے لئے دیکھئے ولیم ڈیلرمپل کے ناول آخری مغل کا باب ایک بے قرار توازن۔

11۔آخری مغل۔ص:63، 12۔آخری مغل ص۔125

13۔1857 کے غداروں کے خطوط از سلیم قریشی اور سید عاشور کاظمی۔ص:67۔انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔2011

14۔1857 کے غداروں کے خطوط۔ص:63، 15۔آخری مغل۔ص:302

16۔1857 کے غداروں کے خطوط۔ص:102

17۔اردو صحافت اور مولوی محمد باقر۔ص:276-277

18۔تاریخ ادب اردو جلد چہارم (حصہ اول) از جمیل جالبی۔ص 20، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔نئی دہلی۔2019

19۔اسباب بغاوت ہند از سرسید احمد خاں ص۔22-26۔علیسا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ علی گڑھ

20۔آخری مغل۔ص:281

21۔ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔انقلاب 1857 نمبر۔اپریل۔مئی 2007 ص:162

22۔مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔ص:26۔انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔2013

23۔دستنبو از مرزا غالب مرتب و ترجمہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ص:25 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔2000

24۔دستنبو۔ص:26-27

25۔غالب اور شاہان تیموریہ از خلیق انجم ص:22-24، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔2009

26۔آخری مغل۔ص:309، 27۔آخری مغل۔ص:309

28۔آخری مغل۔ص:386، 29۔مرحوم دہلی کالج۔ص:65

❑❑❑

ڈاکٹر محمد مستمر (اسسٹنٹ پروفیسر)
ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی-Mob.89208 60709

حسرؔت موہانی کی غزل گوئی کے کچھ امتیازی پہلو

حسرؔت موہانی ۴/ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو قصبہ موہان میں پیدا ہوئے اور ۱۳/ مئی ۱۹۵۱ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ موہان کی نسبت سے حسرؔت موہانی ہو گئے۔ حسرؔت جن کا تخلص اور نام سیّد فضل الحسن ہے وہ اپنے نام کی بہ نسبت تخلص سے زیادہ مشہور ہیں بقول خود ان کے:

عشق نے جب سے کہا حسرؔت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

یہاں ہمارا مقصد حسرؔت کے سوانحی کوائف بیان کرنا نہیں ہے بلکہ حسرؔت کے کلام سے متعلق ان کی غزلوں میں پائے جانے والی فنی خصوصیات و امتیازات کو نشان زد کرنا ہے۔ حسرؔت موہانی ایک شاعر بھی تھے، مولوی بھی تھے اور انہی سب شخصی خوبیوں کے ساتھ وہ ایک مجاہدِ آزادی اور سچے وطن پرست بھی تھے۔ انھوں نے قید و بند کی صعوبتوں اور مشکلات کا بھی سامنا کیا۔ اسی کے ساتھ وہ کارل مارکس کے نظریات سے بھی بے حد متاثر تھے۔ ۱۹۲۵ء میں مولانا حسرؔت موہانی کی جد و جہد اور کوششوں سے ہی پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس کا انعقاد کانپور میں ہوا اور اس مجلس استقبالیہ کی صدارت حسرؔت موہانی نے ہی کی تھی۔ اس مجلس میں مولانا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ حسرؔت موہانی گاندھی جی کے اہنسا وادی خیالات سے پوری طرح سے متفق نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نوکِ قلم اور لاشعوری خلیوں

سے 'انقلاب زندہ باد' جیسا ضرب المثل نعرہ وجود میں آیا۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو حسرتؔ موہانی کی شخصیت ہمہ جہت ہو جاتی ہے اور وہ ایک شاعر، مفکر، مدبر، مصلح نیز سماجی اور سیاسی رہنما اور مجاہد آزادی کے طور پر اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

مذکورہ بالا اقتباس میں حسرتؔ موہانی کے تعلق سے ان نکات اور پہلوؤں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ کوئی بھی تخلیق، فن کار کی ذات کا آئینہ اور ترجمان ہوتی ہے۔ شخصیت کے مجموعے سے ہی فن پاروں کا مجموعہ وجود میں آتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق کو سمجھنے کے لئے اس کی ذات، اس کا تشخص، اس کا عہد، اس کے سماج و معاشرہ اور اس کے ماحول کو سمجھنا بے حد ضروری ہوتا ہے، تبھی کہیں جا کر ہم فن پاروں کی ایماندارانہ طور پر چھان پھٹک کر سکتے ہیں۔

حسرتؔ موہانی انیسویں صدی میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی، ان کی شاعری کا دور ہے۔ ان کے عہد میں جہاں اقبالؔ جیسا بڑا شاعر موجود تھا تو وہیں دوسری جانب طنز و مزاح کا بادشاہ اکبر الہ آبادی، علامہ سیمابؔ اکبر آبادی، تلوک چند محرومؔ، چکبستؔ لکھنوی، سرورؔ جہاں آبادی جیسے بڑے شاعر اپنی شاعری سے اردو کی کہکشاں کو منور کر رہے تھے تو وہیں دوسری جانب، شادؔ عظیم آبادی، شوکت علی خاں فانیؔ بدایونی اور اصغرؔ گونڈوی غزل کو نیا رنگ و آہنگ، جدید لب و لہجہ اور ملے جلے کلاسیکی رچاؤ سے ہمکنار کر رہے تھے۔ تھوڑا ان کے بعد جگر مراد آبادی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ چنانچہ فانی، اصغر، جگر کے درمیان حسرت نے جدید غزل کے مثلث کو مربع میں تبدیل کر دیا۔

جدید غزل کے عناصرِ اربع میں حسرتؔ نے حقیقتاً ایک نئی راہ کا انتخاب کیا۔ حسرت اور اصغر کی آوازوں میں کافی مماثلت تھی اور اس آواز سے ہٹ کر نئی آواز کو جنم دینا حسرت کے لئے کوئی معمولی کام نہیں تھا لیکن حسرت نے اپنی افتادِ طبع، مشقِ سخن، فطری رجحان اور شعری ذوق سے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ حسرت، اصغر اور جگر کی غزلوں کے موضوعات، معاملات اور الفاظ و تراکیب کی بندش و چستی میں کافی حد تک ایک ہی رنگ کی لکیریں کھینچی ہوئی نظر آتی ہیں

لیکن ان خطوں اور لکیروں میں حسرتؔ نے اپنے دونوں معاصرین اصغر اور جگر سے ہٹ کر احساسات و جذبات، خیالات ونظریات میں کچھ نئے رنگ و آہنگ، نئی قوسِ قزح، نئی بو باس اور نئے گل بوٹے سجانے اور لگانے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ اس رنگ و آہنگ، نئی قوسِ قزح اور نئے گل بوٹوں میں انھوں نے حسن و عشق و محبت، شراب و شباب، دیر و حرم کاشی و کعبہ، شمع و پروانہ اور گل وبلبل میں نیا اسلوب پیدا کر کے اپنی منفرد شناخت بنائی۔

حسرتؔ کی غزل سراپا اور سراپا محبوب کے گرد گھومتی اور چکر لگاتی ہے۔ یہ محبوب حقیقی بھی ہے اور دنیاوی بھی۔ زیادہ تر تو وہ عشقِ مجازی کے پردوں میں ہی جھانکنے اور پردوں سے ہی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر تو ان کی غزلوں کا ایک ہی موضوع ہے، اور وہ ہے حسن و عشق، شوق و محبت لیکن اس موضوع میں وہ بہت سے موضوعات کو جنم دیتے ہیں۔ ایک ہی موضوع میں مختلف موضوعات کو جنم دینا یا ایک ہی پہلو کو مختلف زاویوں سے بیان کرنا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ چنانچہ حسرتؔ نے اپنی شاعری کی نیرنگی میں بہزاد و ارژنگ کی طرح لفظوں سے محبوب کی ایسی تصویر کشی اور مرقع نگاری کی ہے کہ بے ساختہ میر ببر علی انیس کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

حسرتؔ نے اپنی غزلوں میں تراکیب و الفاظ کی ایک ایسی فضا بندی کی ہے جو قدم قدم پر قارئین کو جمالیاتی اور رومانی احساس کراتی ہے۔ اس فضا بندی میں حسن و عشق اور شوق و محبت کی وہ کارفرمائیاں، اٹھکھیلیاں، شوخیاں، دُزدیدہ نگاہیاں، شرارتیں، نفاستیں، نزاکتیں، نزہتیں، فرحتیں، مسرتیں، لطافتیں اور میٹھی میٹھی ظرافتیں نظر آتی ہیں جن کا تعلق جذباتِ شباب و شراب سے ہے اور انہی کے درمیان وہ جذبے بھی جنم لیتے ہیں جن کا تعلق ہمارے اعصابِ دروں اور شعور و لاشعور کے نہاں خانوں سے ہے۔ جہاں نفسی کیفیات برابر ضم رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسرتؔ کے احساسات اور جذبات میں ایک فطری رجحان ہمیشہ شامل رہتا ہے جو قاری کو بور

ہونے نہیں دیتا بلکہ اس کے دل و دماغ میں مسرت اور شادمانی کی لہریں چلتی رہتی ہیں۔ ان کے ہجر و وِصال، رنج و غم، درد و الم اور سوز و گداز میں ایک ایسی توانائی اور طاقت و رجذبہ گھلا ہوا ہے جو ان کے کلام کو لازوال اور سدابہار بناتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ یوں رقم طراز ہے:

> ’’حسرتؔ موہانی کل بھی مقبول تھے اور آج بھی مقبول ہیں اور آئندہ بھی مقبول رہیں گے۔ اس قبولِ عام کے اسباب متعدد ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ حسرت شباب کے شاعر ہیں اور ظاہر ہے کہ شباب ایک بہارِ لازوال ہے۔ شباب صرف ایک دورِ عمر کا نام نہیں، یہ ایک خاص مزاج اور رویے کا نام بھی ہے۔ شباب اپنے خاص وقت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ جسمانی جوشِ حیات جب ختم بھی ہو جاتا ہے تب بھی شباب اپنی یاد اور آرزو کی صورت میں زندہ رہتا ہے۔ آدمی عمر کے جس مرحلے میں ہو شباب سے اسے دلچسپی رہتی ہے۔ جذبات و شباب کی شاعری ہر دور میں پڑھی جاسکتی ہے، پڑھی جاتی ہے اور انبساط کا باعث ہوتی ہے۔ مراعات والتفات کے لمحے گزر جانے کے بعد بھی یاد رہتے ہیں۔‘‘
>
> (ڈاکٹر سید عبداللہ، دیباچہ کلیاتِ حسرت: صفحہ نمبر۔ ۷، ناشر: فرید بک ڈپو، دریا گنج، نئی دہلی)

بنیادی طور پر اگر دیکھا جائے تو حسرتؔ موہانی کی کم و بیش پوری غزلیہ شاعری عشق و محبت پر منحصر ہے حالانکہ کہیں کہیں وہ زندگی سے متعلق دوسرے پہلوؤں پر بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ وہ پورے طور پر محبوب سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ کبھی ان کا محبوب حقیقی ہوتا ہے اور کبھی مجازی۔ ان کے خطابیہ انداز میں عشق و محبت کے وہ تمام لوازمات و معاملات پائے جاتے ہیں جن کا تعلق عاشق و معشوق کے نفسیاتی، جبلّی اور فطری پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسرتؔ کی شاعری میں فراقِ یار، حُسن بے پردہ، جہانِ بیخودی، دورِ پیرِ مُغاں، مخصوص غمِ عشق، گردشِ اخلاق، جورِ پیہم، شبِ غم، دیارِ شوق، صبحِ وصال، جلوہ مغرور، بادِ پرنور، نقشِ اُمیدِ وصلِ یار، اظہارِ حالِ آرزو، نرگسِ مخمور، خیالِ یار، ہجومِ شوق، حضورِ یار، چشمِ تصور، نازِ اضطراب، ساغرِ شراب، صہبائے شوق، تختِ جنت، آرزوئے وصل، نگاہِ آشنائے یار، رنجِ فراقِ یار، آرزوئے دلِ مبتلا،

ہجومِ آرزو، آغازِ وحشت، تکلیفِ انتظار، نازِ حُسن، نقشِ لوحِ جاں، ہجومِ ساغر و پیمانہ، پیمانِ وفا، جنونِ شوق، مضرابِ نشاط، فصلِ گل، محرومِ طرب، اربابِ نظر، جبینِ یار، خزانِ دل، داغِ یاس، جمالِ یار، غرورِ حسن، گرفتارِ محبت، رسمِ کہن، چشمِ حیراں، جوشِ اُلفت، نالۂ سحر، خوابِ ناز، آغوشِ مینا، نازِ یکتا، مجبورِ آرزو، حُسنِ شرابی، پیغامِ وفا، حیرتِ حُسن، غمِ ہستی، عہدِ کرم، مشتاقِ شفا، جانِ مبتلا، مصروفِ سزا، طرزِ تغافل، محوِ تماشا، ربطِ فغاں، مستِ خواب جیسے الفاظ وتراکیب پائی جاتی ہیں۔ ان الفاظ کے انتخاب اور تراکیب کی بندشوں میں حسرتؔ موہانی نے ایک ایسی مراعاتی اور محاکاتی کائناتِ غزل آباد کی ہے جس میں میر تقی میرؔ کا درد وغم، مصحفیؔ کا رنگِ غم انبساط اور نسیم دہلوی کی رنگین چاشنی مل کر حسرتؔ کی اپنی آواز بن گئی ہے۔ اس طرح کی بے شمار تراکیب اور بھی غزلہائے حسرت میں ملتی ہیں۔ راقم کے نزدیک تراکیب کی اختراع کوئی سہل کام نہیں ہے۔ یہ ملکہ اسے ہی حاصل ہوتا ہے کہ جس نے کلاسیکی شعرا سے فیضان حاصل کیا ہو اور دوسرے علوم و فنون کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہو۔ تراکیب کا یہ جہان ایک جہانِ معانی آباد کرتا ہے۔ جس میں حسرت کی ذہانت وفطانت، پروازِ تخیل اور علوئے خیال کو بہ خوبی دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ حسرت نے عقیدتاً اپنی غزلوں میں میر، مصحفی اور نسیم کے رنگِ سخن اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ برملا ان شعرا کا ذکر اپنی غزلوں میں کرتے ہیں۔ نیز ان شعرا کے کلام میں پائے جانے والے شعری محاسن کو اپنے قلم کی گرفت میں لینا گویا کہ خود حسرتؔ کے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ کچھ شعر بطورِ خاص ملاحظہ کیجئے ؎

حسرتؔ تری شگفتہ نگاری پہ مرحبا
یاد آ گئیں نسیمؔ کی رنگیں نگاریاں

....

حسرت مرے کلام میں مومنؔ کے رنگ ہیں
ملکِ سخن میں مجھ سا کوئی دوسرا نہیں

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔو نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

....

طرفہ حسرتؔ بہ شوخیٔ انشاؔء
رنگِ جرأتؔ میرے بیان میں ہے

....

شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

اس طرح دیکھا جائے تو حسرتؔ موہانی اپنے متقدمین کا جو اثر قبول کرتے ہیں اس کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں کئی رنگوں کی قوسِ قزح نظر آتی ہے لیکن حسرت کا سب سے بڑا فنی اور شعری کمال یہی ہے کہ انھوں نے اس ست رنگی دھنک میں ایک وہ رنگ بھی قائم کیا ہے جو ان کا اپنا رنگ ہے، اپنا مزاج ہے، اپنا آہنگ ہے۔ ایسا رنگ و آہنگ و مزاج کہ جس میں دور تک خط حسرت کشیدہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اس کشیدگی میں حسرت کا زورِ بیان، اندازِ بیان، اسلوبِ بیان، طرزِ نگارش، فہم و فراست، ذہنی رسائی، خوش فکری، سماجی شعور، بصیرتِ حسن و عشق اور ادراکِ ہجر و وصال شامل ہے۔ گو اس امر شمولیت میں حسرت کے خیالات و جذبات و احساسات کی نیرنگی اور اندازِ بیان کی رنگینی ایک ایسا سحر و خمار پیدا کرتی ہے کہ یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ حسرت نے غزل کی بساط ہی پلٹ کر رکھ دی اور غزل کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کر کے نہ صرف غزل کو معنویت و وسعت بخشی بلکہ دامنِ اردو کو بھی فارغ البال اور ثروت مند کیا۔ اس نیرنگیٔ خیال اور رنگین بیانی کے تعلق سے جگہ جگہ خود حسرتؔ اپنی غزلوں میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

اردو میں کہاں ہے اور حسرتؔ
یہ طرزِ نظیریؔ و فغانیؔ

حسرتؔ اردو میں ہے غزل تیری
پرتوِ نقشِ سعدیؔ و جامیؔ

....

قائم ہے ترے دم سے ہی طرزِ سخن قائمؔ
پھر ورنہ کہاں حسرتؔ یہ طرزِ غزل خوانی

....

شیرینئ نسیمؔ ہے سوز و گدازِ میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

'لطفِ سخن تمام' کی ترکیب اپنے تعلق سے کوئی دل گردے والا شاعر ہی کر سکتا ہے لیکن اس طرح کی بے باک اور نڈر بات وہی کہہ سکتا ہے کہ جس کے اندر دم خم ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ناقدین ادب حسرت کی اس منظوم طرزِ گفتگو اور اندازِ بیان کو تعلّی سے بھی موسوم کریں لیکن کچھ بھی ہو حسرت کی یہ تعلّی اور طرزِ سخن حقیقت پر مبنی ہے۔ اس نوعیت سے دیکھا جائے تو حسرت کے کلام میں ایسے پیکروں کو تلاش کیا جا سکتا ہے اور ایسی آواز کو سنا جا سکتا ہے کہ جو دہلی اور لکھنؤ دبستان کا حسین امتزاج ہے اور اس امتزاج و آمیزش میں مسحوریت و مخموریت کی فضا بندی ہے۔ مسحوریت و مخموریت کا شعری و فنی وصف کلامِ حسرت کو مزید شگفتہ اور شائستہ بناتا ہے۔ نیز اس شگفتگی اور شائستگی میں بالخصوص غزل کی وہ پھلواریاں، گل کاریاں، بیل بوٹے اور نقش و نگار شامل ہیں جہاں حسرت کا محبوب کے تعلق سے ایک ایسا حقیقی تصورِ جمالِ یار محلل ہے جسے غزل کے نئے آہنگ اور غزل کی روایت نو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہئے۔ حسرت نے غزل کو وہ لب ولہجہ، سُر اور تال عطا کیے جو شاید ان سے پہلے کسی نے غزل کو نہیں بخشے تھے۔ اسی لئے غزلِ حسرت نے کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ چپکے چپکے آنسو بہاتی ہوئی، غرفے سے آنکھیں لڑاتی ہوئی، دانتوں میں انگلی دباتی ہوئی، پردے کو دفعتاً کھینچتی ہوئی، دوپٹے سے منہ چھپاتی

ہوئی، چوری چھپے راتوں کو آتی ہوئی، رورو کر رُلاتی ہوئی، میٹھی میٹھی باتیں چھیڑتی ہوئی، کوٹھے پہ ننگے پاؤں آتی ہوئی اور شوق میں مہندی کے بے دست و پا ہوتی ہوئی، جدیدیت کے گلشن میں چپکے سے داخل ہو کر ایک نئی دنیا بسا لی۔ اس نئی دنیا میں حسرت نے غزل کو ہر پہلو، ہر زاویے، ہر نکتے اور نقطۂ نگاہ سے پرکھنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔

حسرت کی غزلوں میں بانکپن ہے، شوخی ہے، البیلا پن ہے، سرمستی ہے۔ ایک نشہ وسرور کی کیفیت ورنگت ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ فنی اوصاف حسرت سے پہلے کسی اور شاعر کی غزلوں میں نہیں پائے جاتے۔ بالکل پائے جاتے ہیں۔ مگر حسرت کی شوخیاں اور غمزے منفرد ہیں۔ جیسا کہ اوپر بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے متقدمین کے رنگوں سے کسبِ نور اور پرتوِ سخن لے کر ایک مہتابِ سخن کو جنم دیا ہے۔ وہ جام وشراب کی بات کرتے ہیں اور حسن و شباب کی بھی۔ ان کے یہاں ہجر و وصال کے بھی قصے ہیں اور حسن کی رعنائیاں بھی انگڑائی لیتی نظر آتی ہیں اور انہی انگڑائیوں میں وہ جذبات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا رشتہ ہماری نفسی خواہشوں اور جنسی تقاضوں سے ہوتا ہے۔ حسرت کی غزلوں کے بین السطور میں واضح طور پر نہیں تو ہلکے طور پر یہ جذبے اپنی موجودگی کا احساس ضرور کراتے ہیں۔ لیکن ان تمام عشقیہ اور ہجر و وصال کی باتوں میں حسرت کے یہاں گل وبلبل اور شمع و پروانہ کے روایتی قصے جنم نہیں لیتے بلکہ ان کے یہاں حسن وعشق کے وہ نقش ونگار ابھرتے ہیں جن میں حسرت کی فکر اور شعور موجود رہتا ہے۔ ان کے یہاں عشق کی معاملہ بندیاں، تصوف کے رموز و نکات، تزکیہ نفس کی باتیں، فنا کی ازل سے شناسائی، فتنۂ عشوۂ گفتگو اور قیدِ حیات کے فلسفے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں اہلِ وفا سے عنوانِ التجا میں محرومیاں بھی سانس لیتی ہیں اور نگہ آشنا میں مانوسیت بھی شامل رہتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر مرحلے میں محبوب سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب سے اپنی دلی بے قراریوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور حالِ دل بھی بیان کرتے ہیں نیز خواہشِ وصل انھیں مضمحل بھی رکھتی ہے اور پریشان بھی۔ اس حالِ دل اور بے قراریوں میں حسرت کی غزلوں میں سوز و

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

....

آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو، رو کے مجھ کو بھی رُلانا یاد ہے

....

نہ سہی آپ جفا سے جو نہیں باز آتے
جائیے جائیے اب ہم کو بھی اصرار نہیں

....

تم ہو کہ تمھیں وعدہ وفائی کی نہیں خو
میں ہوں کہ مجھے تم سے تقاضا نہیں آتا

....

مجھ سے تنہائی میں گر ملیئے تو دیجے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

حسرتؔ حقیقتاً حسن پرست ہیں لیکن ان کی حسن پرستی میں جنسی تلذذ کم اور نفاست اور پاکیزگی زیادہ پائی جاتی ہے اور یہی پاکیزگی انھیں دہلویت کے قریب کر دیتی ہے۔ عشق کرنا انھیں بہ خوبی آتا ہے۔ وہ مختلف اندازِ بیان اور اسلوبِ تخاطب سے عشق کے رموز و اسرار کو بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کے حسن و عشق میں ایک گہری چاشنی اور سرخی مائل رچاؤ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک رند مشرب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی رندی میں ایک خمار بھی ہے اور ایک سحر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنا محبوب مخمور و مسحور دکھائی دیتا ہے۔ ساغر و جام و مینا و سبو اور مطرب وساقی، پیرِ مغاں جیسی اصطلاحات حسرت کے کلام کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یہ اصطلاحات، کنایے اور استعارے کبھی قاری کو تصوف کا عرفان کراتے ہیں اور کبھی عشقِ مجازی کی طرف لے جاتے ہیں

چنانچہ ان کے خمریاتی شعروں میں جہاں سرمستی اور سرور کی کیفیت پائی جاتی ہے تو وہیں ایک شکوہ وشکایت اور طنز کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ مگر اس طنزیہ انداز میں حسرت کو اپنا محبوب بعض وقت مکمل شراب میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اصل میں حسرت کے دیکھنے کے انداز اور نظریے میں ہی ایک مخموریت پیوست رہتی ہے۔ اسی لئے انھیں اپنا ہم نشیں بھی 'ساغرِ شراب' اور 'مینائے غزل' دکھائی دیتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

جب دیا تم نے رقیبوں کو دِیا جامِ شراب
بھول کر بھی مری جانب کو اشارا نہ کیا

....

مست صہبائے شوق ہے حسرتؔ
ہم نشیں ساغرِ شراب اُٹھا

....

رنگ یہ لایا ہجومِ ساغر و پیمانہ آج
بھر گئی سیرابیوں سے محفلِ رندانہ آج

حسرت کی خوبی یہی ہے کہ وہ عشقِ حقیقی ومجازی دونوں نہج میں رنگینی اور شگفتگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اپنی غزلوں میں جمالیاتی ورومانی جذبوں اور حسوں کو اتنی خوبصورتی کے ساتھ ضم کرتے ہیں کہ انہی کہ درمیان نفسیاتی کیفیتیں بھی رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھانا شروع کر دیتی ہیں۔ لیکن ان نفسیاتی کیفیتوں میں فاسد خیالات کا بہاؤ نہیں ہوتا بلکہ معشوق کے حوالے سے وہ تلازمے جنم لیتے ہیں جن میں شعوری طور پر طبعی وجبلی نفسی پیکر تراشیاں ہوتی ہیں۔ کلیاتِ حسرت میں ایسے بہت سے شعر مل جائیں گے کہ جن میں جبلی وفطری پیکر ابھر کر لاشعور سے شعور تک اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ حسرت کا کمال یہی ہے کہ وہ نفسی جذبوں میں بہت کم سوقیانہ رویوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کے شعروں میں وہ دبے دبے، ہلکے ہلکے فطری جذبے پیوست ہوتے ہیں جو انسانی شریانوں اور اعصابی نظام میں ایک ہلچل پیدا کرتے ہیں اور قشری لختوں کو

مشتعل بناتے ہیں۔ نیز حسرت اپنی بات کو جمالیاتی انداز میں بڑی خوبصورتی اور فنکاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

وصل کی شب بھی ہوئی جاتی ہے صرفِ اضطراب
اس ہجومِ آرزو کو یا الٰہی کیا کروں

....

شورشیں جاتی رہیں وہ آرزوئے وصل کی
رنجِ دوری مرہمِ زخمِ تمنا ہو گیا

....

کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

....

اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحرِ بے قرار
کچھ پوچھئے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

....

غرق ہے رنگینیوں میں مستیوں سے چور چور
ہے سراپا بے خودی وہ نرگسِ مستانہ آج

حسرت مکمل طور پر محبت میں گرفتار نظر آتے ہیں اور اس جذبۂ محبت میں وہ کشمکش میں بھی مبتلا رہتے ہیں۔ جہاں آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک طویل سلسلہ حسرت کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ خود معترف ہیں کہ ان کے مزاج میں ایک لا اُبالی پن ہے جو انھیں پریشان بھی رکھتا ہے اور غمِ جاناں میں گرفتار بھی۔اصل میں محبت ایک ایسا فطری جذبہ ہے جس میں عام آدمی سے لے کر فنکار تک شش و پنج کا شکار رہتا ہے۔وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ کدھر جائے۔؟اس کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ وہ عجیب الجھنوں میں پھنسا رہتا ہے۔کبھی وہ ترکِ الفت کی بات کرتا ہے،

کبھی غموں سے نجات چاہتا ہے،کبھی غموں کو ہی اپنی بیماری کا مداوا بتاتا ہے،کبھی محبوب کی یادوں کو بھلانا چاہتا ہے تو کبھی یادوں کے سہارے ہی جینے کی بات کرتا ہے۔لہٰذا ایک شکیبائی اور ناشکیبائی کی تعاملیت کارفرما رہتی ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو فنکار کی ذات ایک خبطی،مراقی اور مجنوں کی ہو جاتی ہے۔لیکن فنکار کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو پاگل پن کی حدوں میں داخل ہونے نہیں دیتا بلکہ اپنی نیوراتی کیفیت کو فن کے سانچے میں اس توانائی سے ڈھالتا ہے کہ اس کی دلی کیفیت اور دلی جذبات آفاقی بن جاتے ہیں۔حسرت کے کلام میں پائی جانے والی بے زاریوں،محرومیوں اور اُداسیوں نے بھی کچھ ایسی ہی عالم گیر نوعیت اختیار کر لی ہے۔لیکن ان غمگساریوں اور محرومیوں میں ایک چستی،سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے جو خارجیت سے داخلیت کا سفر طے کرتی ہے اور حسرت کو ابنارمل اور قنوطی ہونے سے بچا لیتی ہے۔اس ضمن میں کچھ شعر حاضر ہیں۔

عجب انداز ہے میرے مزاجِ لا اُبالی کا
نہ ممنونِ تمنا ہوں نہ مشتاقِ مسرت ہوں

....

سب نے چھوڑا تجھے مگر حسرتؔ
درد کی غمگساریاں نہ گئیں

....

مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر اے عجب!
یادِ یار آتی ہے کیوں بے اختیار اب کی برس

....

ملتیں کہاں گدازِ طبیعت کی لذتیں
رنجِ فراقِ یار بھی راحت فزا ہے کیا؟

....

اب وہ ہجومِ شوق کی سرمستیاں کہاں
مایوسیٔ فراق نے دل ہی بجھا دیا

....

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

....

غمِ دوری نے کشاکش تو بہت کی لیکن
یاد ان کی دلِ حسرت سے بھلائی نہ گئی

مولانا حسرتؔ موہانی نے اپنے ایک مضمون میں شاعری کے تعلق سے کچھ نظریات پیش کیے تھے، موصوف کے خیال میں غزلوں یا اشعار کی قسمیں اس طرح ہیں: عاشقانہ، عارفانہ، فاسقانہ، ماہرانہ، نافعانہ، ضاحکانہ، شاعرانہ، واصفانہ اور باغیانہ۔ کلامِ حسرت میں ہمیں عاشقانہ، عارفانہ، نافعانہ، شاعرانہ اور واصفانہ اشعار ملتے ہیں۔ حسرت کا یہ مخمس شعری محاسن انھیں عاشق مزاج بھی بناتا ہے، صوفی کا لبادہ بھی زیبِ تن کراتا ہے، ناصح اور عارف کی صف میں بھی کھڑا کرتا ہے اور قلندر کی شان بھی عطا کرتا ہے۔ لیکن اس قلندری میں خانقاہیت جنم نہیں لیتی اور نہ ہی وہ عالمِ برزخ اور بوئے اسداللّٰہی کی بات کرتے ہیں بلکہ یہ قلندری سیاسی و سماجی شعور کا وجدان و عرفان کرتی ہوئی چکی کی مشقت اور قید و بند کی صعوبتوں سے آشنا ہوتی ہے۔ مثلاً۔

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

....

بڑھ چلا جوشِ آرزو حسرتؔ
ختم ہونے کو آئی قیدِ فرنگ

....

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

....

سویّت آپ کا مقصد، بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرتؔ کی غزل خوانی نہیں جاتی

....

بڑا چور ہے نفسِ امارہ حسرتؔ
نہ سننا کبھی اس کمینے کی باتیں

....

جب سوا میرے نہ تھا کوئی نشانہ تیرا
یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ زمانہ تیرا

....

لے چلی ہے پھر آرزوئے حرم
عاشقانِ حرم کو سوئے حرم

....

فنا ہے بقا مسلک عاشقی میں
اگر رونما ہو دیارِ نبی میں

حسرتؔ کی غزل گوئی کے حوالے سے ایک بات خاص طور پر نوٹ کرنے والی ہے جو کمال کی بھی ہے اور حسرت کی شخصیت و کردار کے تعلق سے حیرت میں بھی ڈالتی ہے۔ وہ ہے ان کی فطرت کے برعکس 'مزاجِ غزل'۔ ان کی زندگی کے اگر پہلوؤں کو کھنگالا اور تلاشا جائے تو وہ فطرتاً ایک انقلابی، مجاہد آزادی، وطن پرست، پکے کانگریسی، مصلح اور قومی و سیاسی رہنما تھے۔ انھوں اپنی زندگی کے لیل و نہار جیل کی چہار دیواری میں کاٹے اور قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار

ہوئے۔ انگریزی حکومت کا عتاب و عذاب برداشت کیا۔ قید کی چہار دیواری میں رہ کر زلفِ شاعری کے پیچ وخم سنوارے۔ بے شمار غزلیں زنداں میں رہ کر تخلیق کی گئیں لیکن اس زندانی ادب میں دور دور تک زندانیت نظر نہیں آتی ۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور سوچنے کا مقام بھی کہ انھوں نے اپنی افتادِ طبع اور فطرت کے برعکس غزل کی آبیاری کی ۔اپنے ماحول ، سماج اور معاشرے کی آواز کو انھوں نے غزل کی آواز نہیں بنایا بلکہ گہرائی سے دیکھا جائے تو حسرت نے 'مزاجِ غزل' کے موافق ہی اپنے مزاج کو ڈھال لیا تھا۔ نیز اس 'مزاج' کا انھوں نے تاحیات احترام بھی کیا اور اس سے مانوسیت اور شناسائی بھی قائم کی ۔ ورنہ اکثر یہی دیکھا گیا اور سنا گیا ہے کہ فنکار یا تخلیق کار کی جیسی فطرت ہوتی ہے اسی طرح کا اس کا مزاج بھی ہوتا ہے اور اسی مزاج کے سانچے میں ڈھل کر وہ فن کی تخلیق بھی کرتا ہے ۔ یہاں مثالیں پیش کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا جو لوگ ادب کی فہم رکھتے ہیں وہ ہر شاعر اور ادیب کے بارے میں جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنی فطرت و مزاج کے مطابق ہی فن پاروں کی تخلیق کی ہے۔ حسرت کی فطرت اور مزاج میں تضاد ہے ۔ تضاد کا یہ عمل متحیر کن بھی ہے اور وصفِ طرہ پر بھی منحصر ہے۔ لیکن اس کیفیتِ تضاد میں انھوں نے کائنات کے حسن (جو تضاد پر ہی منحصر ہے) کی طرح دامنِ غزل میں بھی خوبصورتی پیدا کردی ہے۔ وہ اندھیری کال کوٹھری میں بھی صعوبتوں اور آلام کے درمیان محض اور محض غزل کی بات کرتے ہیں۔ تغزل کے علاوہ انھیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ انھیں ہر حال میں غزل کی مینا کاری عزیز ہے۔ وہ زنداں میں بھی حسن وعشق کے تلازمے تراشتے اور تلاشتے ہیں۔ کبھی یہ تلازمے عشقِ حقیقی کے قریب ہوجاتے ہیں اور کبھی عشقِ مجازی کی حدود میں داخل۔ ساقی ، میخانہ، مرشد، پیرِ مغاں جیسے استعاروں اور کنایوں کا سہالے کر زنداں میں بھی عشق اور وصل کی لذتوں کے مزے لیتے ہیں۔ وہ کسی حال میں بھی محبت ترک کرنا نہیں چاہتے۔ انھیں قید خانے میں بھی کوچۂ یار نظر آتا ہے۔ مثلاً ۱۶ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو فیض آباد جیل میں کئی غزلیں لکھتے ہیں۔ کچھ شعروں میں یوں فرماتے ہیں ؎

ہوئے۔ انگریزی حکومت کا عتاب وعذاب برداشت کیا۔ قید کی چہار دیواری میں رہ کر زلفِ شاعری کے پیچ وخم سنوارے۔ بے شمار غزلیں زنداں میں رہ کر تخلیق کی گئیں لیکن اس زندانی ادب میں دور دور تک زندانیت نظر نہیں آتی۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور سوچنے کا مقام بھی کہ انھوں نے اپنی افتادِ طبع اور فطرت کے برعکس غزل کی آبیاری کی۔ اپنے ماحول، سماج اور معاشرے کی آواز کو انھوں نے غزل کی آواز نہیں بنایا بلکہ گہرائی سے دیکھا جائے تو حسرت نے 'مزاجِ غزل' کے موافق ہی اپنے مزاج کو ڈھال لیا تھا۔ نیز اس 'مزاج' کا انھوں نے تاحیات احترام بھی کیا اور اس سے مانوسیت اور شناسائی بھی قائم کی۔ ورنہ اکثر یہی دیکھا گیا اور سنا گیا ہے کہ فنکار یا تخلیق کار کی جیسی فطرت ہوتی ہے اسی طرح کا اس کا مزاج بھی ہوتا ہے اور اسی مزاج کے سانچے میں ڈھل کر وہ فن کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ یہاں مثالیں پیش کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا جو لوگ ادب کی فہم رکھتے ہیں وہ ہر شاعر اور ادیب کے بارے میں جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنی فطرت و مزاج کے مطابق ہی فن پاروں کی تخلیق کی ہے۔ حسرت کی فطرت اور مزاج میں تضاد ہے۔ تضاد کا یہ عمل متحیر کن بھی ہے اور وصفِ طرہ پر بھی منحصر ہے۔ لیکن اس کیفیتِ تضاد میں انھوں نے کائنات کے حسن (جو تضاد پر ہی منحصر ہے) کی طرح دامنِ غزل میں بھی خوبصورتی پیدا کردی ہے۔ وہ اندھیری کال کوٹھری میں بھی صعوبتوں اور آلام کے درمیان محض اور محض غزل کی بات کرتے ہیں۔ تغزل کے علاوہ انھیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ انھیں ہر حال میں غزل کی مینا کاری عزیز ہے۔ وہ زنداں میں بھی حسن وعشق کے تلازمے تراشتے اور تلاشتے ہیں۔ کبھی یہ تلازمے عشقِ حقیقی کے قریب ہو جاتے ہیں اور کبھی عشقِ مجازی کی حدود میں داخل۔ ساقی، میخانہ، مرشد، پیرِ مغاں جیسے استعاروں اور کنایوں کا سہالے کر زنداں میں بھی عشق اور وصل کی لذتوں کے مزے لیتے ہیں۔ وہ کسی حال میں بھی محبت ترک کرنا نہیں چاہتے۔ انھیں قید خانے میں بھی کوچۂ یار نظر آتا ہے۔ مثلاً ۱۶ ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو فیض آباد جیل میں کئی غزلیں لکھتے ہیں۔ کچھ شعروں میں یوں فرماتے ہیں ۔

خیلِ عشاق کو سر گرمِ تمنا دیکھو
کوچۂ یار میں اک حشر ہے برپا دیکھو
جور پر جور جفاؤں پہ جفائیں دیکھیں
حوصلہ اپنی محبت میں ہمارا دیکھو
یوں ہی مشہور تمھارا ہے غضب رنگِ ستم
قتل کر کے ہمیں تم اور بھی چمکا دیکھو
وعدۂ وصل کو ہنس ہنس کے نہ ٹالو کل پر
تم نے پھر آج نکالا وہی جھگڑا دیکھو
واعظو! مرشدِ کامل کی تمھیں ہو جو تلاش
بزمِ رنداں میں بھی اک روز ذرا دیکھو

....

قفس میں صیاد بند کر دے نہیں تو بے رحم چھوڑ ہی دے
میانِ امید وبیم آخر رہیں گے ہم زیرِ دام کب تک

مذکورہ شعروں میں پہلے تین شعروں کے اگر پسِ پشت یا متن کے بطن میں جھانکنے کی کوشش کی جائے تو ان شعروں میں جور، جفاؤں، رنگِ ستم، قفس، صیاد اور زیرِ دام سے مراد فرنگی ظلم وستم لیے جا سکتے ہیں جس کو حسرت نے رنگِ غزل کا لباس پہنا کر تغزل کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔لیکن یہاں بھی حسرت نے اُن تیوروں سے کام لیا ہے جو غزل کی آن بان اور شان ہیں۔اس طرح کے اشعار پڑھ کر کوئی نیرنگِ زمانہ کا راست تصور نہیں ابھرتا بلکہ نیرنگِ جاناں کی ہی سرخی نظر آتی ہے۔جیل کی چہار دیواری میں شعروں کے درمیان جن کنایوں سے حسرت کام لیتے ہیں ان میں ان کا کہیں نہ کہیں ڈھکا چھپا درد عیاں ہو جاتا ہے اور پھر وہ خدا کی ذات سے اس طرح ہم کلام ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

نہ بھولا گھر کے اعدا میں بھی حسرتؔ
ترے فرمودۂ لا تقنطو کو

....

زمانے میں اگر کوئی نہیں اپنا تو کیا پروا
کسی سے کیا غرض مجھ کو کہ میرا آسرا تم ہو

حسرت کے یہاں ایک طویل خیالِ وصل اور تصورِ وصال ہے۔ ان کے اعصاب پر تصورِ وصالِ یار پوری طرح حاوی یا سوار ہے۔ ان کے حرام مغز اور لاشعوری نہاں خانوں میں فتنے برپا ہیں۔ دلِ حسرت میں ایک تڑپ ہے وصالِ یار کی، جس سے وہ تسکین چاہتے ہیں اور ایک تشنگی ہے جس سے وہ سیرابی کے خواہاں ہیں۔ گزشتہ صفحے پر جو بات حسرت کے تعلق سے عبادت بریلوی کی کوٹ گئی تھی ''کہ انشاء کی شوخی، غالب کی تعیش پرستی، داغ کی ہوسناکی'' وہ صد فی صد حسرت کے غزلیہ کلام پر صادق آتی ہے۔ شوخی، تعیش پرستی اور ہوسناکی کا یہ فنی مثلث قدم قدم پر ہمیں موصوف کی غزلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ جیل کے باہر ہوں یا پھر قید خانے میں ان کے ذہن کے دریچوں میں خیالِ وصالِ محبوب کنڈلی مارے بیٹھا ہوا ہے جب بھی تصوراتی غرفے سے حسرت جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں نیز حسن کی تابانیوں، خوشگوار موسم، شبنم کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں، چٹکتی چاندنی اور بہتے ہوئے تازہ ہوا کے جھونکوں، برسات کے موسم، پُر نور کہکشاں، مہکتے رنگ برنگی پھولوں، لہکتی ہوئی نازک شاخوں، کل کل کرتے آبشاروں، سرخیٔ شفق، افق کی مسکراہٹ جیسے حسین نظاروں سے ان کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں تو فوراً وصل کا ہیولیٰ یا پیکر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی دبی ہوئی خواہشوں اور نفسی تقاضوں کا اظہار کرنے کے لئے ہجومِ آرزو، ہجومِ شوق، وفورِ شادمانی، وعدۂ وصل، وعدۂ فردا، وقفِ یادِ شباب وجنوں جیسی تراکیب کا استعمال کرتے ہیں۔ بات شبِ وصل کی ہو یا اضطرابِ وصل کی یا پھر حسنِ وصل کی ہر زاویے سے حسرت کے یہاں ایک پوشیدگی رہتی ہے۔ اگر یوں کہہ دیا جائے کہ ان کے حبسیاتی

کلام میں ہلکی ہلکی جنسیاتی کیفیت رچ بس گئی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر اس جنسیاتی کیفیت میں وہ الفاظ کے اوپر ایک ایسی ردائے گف تان دیتے ہیں کہ جہاں جنسی جذبہ ابھرتا تو ہے مگر اس میں پاکیزہ پن قائم رہتا ہے۔ اس میں سوقیانہ، اخلاقی پستی اور ابتذال کی کیفیت جنم نہیں لیتی جو لکھنوی شعراء کا ایک خاص امتیاز ہوا کرتا تھا۔ اس ضمن میں چند شعر بطور نمونہ ۔

اس نازنیں نے با وصفِ عصمت
کی وصل کی شب وہ بے حجابی

....

پوچھو نہ شبِ وصل کی لذت کہ ابھی تک
بدلا ہے رُخِ شوق کا از روئے طرب رنگ

....

ہیں سرورِ وصل سے لبریز مشتاقوں کے دل
کر رہی ہیں آرزوئیں سجدۂ شکرانہ آج

....

شبِ وصل صنم ہے وقتِ عیش و کامرانی ہے
ہجومِ آرزو وجہِ وفورِ شادمانی ہے

حسرتؔ کی پوری شاعری رنگین مزاجی سے عبارت ہے۔ اس عبارت میں انھوں نے سیکڑوں ایسی حسین اور خوش نما لکیریں کشیدہ کی ہیں جو حسرت کو تو جینے کا حوصلہ دیتی ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ پڑھنے والے کو بھی حظ وانبساط سے شرابور کراتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسرت کی اس شرابوریت میں بوریت نہیں بلکہ شادمانیوں کا ایک حسین سلسلہ ہے۔ اگر چہ وہ سیکڑوں عبارتوں میں کبھی ہجر کی بات کرتے ہیں تو کبھی رنج والم کی مگر وہ ہر حال میں زندہ رہنے کے ہنر سے آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے محبوب کا سراپا عمیق خارجی وداخلی مشاہدہ و تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے مشاہدات میں محبوب کے ہزاروں پیکر اور عکس جنم لیتے ہیں۔ وہ محبوب کی ہر زاویے سے

بہزاد وارژنگ کی طرح تصویر کشی کرنا بہ خوبی جانتے ہیں اور اس تصویر کشی میں حسرت کے تخیل، ذہنی رسائی اور فکر کے ست رنگی رنگ بھرے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ست رنگی رنگ ان کو جمالیاتی و رومانی فضا میں لے جاتے ہیں اور پھر یہیں سے شروع ہوتا حسرت کے نفسیاتی پیچ وخم کا سلسلہ۔ وہ اپنے محبوب کی آنکھوں، لبوں، رخساروں اور نگاہِ ناز کا بہت باریکی اور ژرف نگاہی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسرت اپنے محبوب کی روح میں اُترنے کے ہنر سے واقف ہیں اور پھر علمِ نفسیات تو ہے ہی روح کا علم اور انسان کے اعمال و افعال، حرکات وسکنات، نشست و برخاست کا مطالعہ۔ اور حسرت اس ضمن میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کے نہاں خانوں میں بھی حبل الورید ہیں اور خارجی اعضا کا بھی نفاست وفراست کے ساتھ احاطہ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ محبوب کی نازک خیالیوں، غمزوں، عشووں، نخروں اور اداؤں سے بہ خوبی واقف ہیں حتی کہ ان اداؤں اور نخروں میں کیا کیا فتنے اور کرشمہ سازیاں ہیں اس سے بھی حسرت کے میکانکی آخذہ بیدار رہتے ہیں۔ مثلاً ؎

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

....

لگی ہے مرے لب پہ مہرِ خموشی
مگر واقفِ سرِ مستور ہوں میں

....

میرا نشاں مٹائے تامل ہے اس میں کیوں
کس نے بدل دیا نگہِ یار کا مزاج

....

وہ حیا پرور ملا کس طرح مجھ سے کیا کہوں
بے خودی افزا ہے یعنی داستانِ روزِ عید

ان کی نگہِ مست کے جلوے ہیں نظر میں
بھولے سے بھی ذکرِ مے و مینا نہیں آتا

مجموعی طور پر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حسرت خالص غزل کے شاعر ہیں۔غزل سے مراد وہ غزل ہے جس میں تغزل ہو، جمالیاتی حِس ہو اور رومانی فضا ہو۔ان کی غزلوں میں یہ اختصاص واعزاز پوری کائناتِ غزل میں جلوہ گر ہے۔اس جلوہ گری میں حسرت کی وہ جدتِ طبع اور وہ ندرتِ شعور برابر شامل رہتی ہے جو حسرت کو اپنے معاصرین شعراء سے منفرد شناخت عطا کرتی ہے۔وہ صرف اور صرف غزل کے لئے جیتے ہیں۔ان کی رگ و پے میں فقط اس آوازِ حسن وعشق وشوق کا انضمام ہے جسے رنگِ حسرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام مسرت وشادمانی کا پیغام ہے۔مثلاً اس بیان کا اعتراف یوں کرتے ہیں ۔

غزل گوئی رہی یکتا میانِ عاشقاں میری
کہاں سے پھر کوئی لاتا بیاں میرا زباں میری

اساسی طور پر اگر دیکھا جائے تو ان کی غزلیں تفننِ طبع کی ہی غماز ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ تفننِ طبع کو بھی زندگی سے الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ صحیح نہیں کرتے۔لطافتیں اور ظرافتیں بھی انسانی زندگی کا ہی ایک حصہ ہیں اور زندگی کے اس حصے میں لطافت اور رنگینیٔ دوراں اور شگفتگیٔ جاناں کو شامل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔لیکن حسرت نے اس فن کو بہ خوبی نبھایا ہی نہیں بلکہ اس میں زندگی کی لطافتوں، رونقوں اور شادمانیوں کے حسین گل بوٹے بھی کھلائے ہیں۔جن میں زندگی کی رمق اور شفق پیوست ہے جو ہمیشہ زندہ و تابندہ رہنے والی ہے۔ان کی شاعری کسی خاص وقت کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری میں قدم قدم پر سدا بہار نغمے پھوٹتے ہیں جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اور یہ متوجہ کرنا بے ساختگی کی دلیل و ضمانت ہے۔اس بے ساختگی میں کرختگی نہیں بلکہ نرم و نازک شبنم کی سی بوندیں ہیں۔بے شمار پیکر تراشیاں ذہن، دل اور دماغ پر دستک دیتی ہیں۔اسی کے ساتھ حسرت نے تشبیہات و

استعارات اور دیگر صنائع و بدائع کا برمحل اور خوش نما استعمال کر کے غزل کے حسن کو دو بالا کر دیا ہے۔ حسرت کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بہ خوبی ہوتا ہے کہ وہ الفاظ و تراکیب کے بادشاہ ہیں۔ جیسی نادر، جدید اور البیلی تراکیب ان کے یہاں پائی جاتی ہیں وہ شاید کسی دوسرے شاعر کے یہاں پائی جاتی ہوں۔ حسرت کی یہ فارسی آمیز تراکیب حسنِ کلام میں شگفتگی، شائستگی، شستگی، رنگینی، نغمگی، موسیقی اور ایک ایسی چاشنی و شیرینی پیدا کرتی ہیں جس میں بوریت نام کی چیز نہیں ہے۔ درحقیقت انھوں نے ان تراکیب سے ایک جادوئی فضا پیدا کی ہے۔ اگرچہ ان فارسی آمیز تراکیب سے کلام تھوڑا مشکل ہو گیا ہے مگر یہ مشکل پسندی وہاں بے معنی ہو جاتی ہے کہ جب قاری ایک رَو کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے جو حسرت کے کلام کی سلاست اور برجستگی کی علامت ہے۔ حسرت کی اس تراکیب سازی کو دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور حسرت کی قادر الکلامی، کہنہ مشقی، مضمون آفرینی، شاعرانہ صلاحیت ولیاقت، مفکرانہ شان اور عاشقانہ مزاج کا قائل بھی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں کی دلبری، ربطِ ناز و نیازِ محبت، جانِ حسنِ کلام، بایمائے نازِ حسن، سرچشمہ فروغِ آگہی، نگہِ شوق، مسرتِ غمِ جاودانی، خیالِ برق و تجمل درحقیقت اُداس دلوں اور مضمحل ذہنوں کے لئے ایک ٹانک سے کم نہیں ہے۔ چنانچہ آخر میں رنگِ حسرت کی انفرادیت کے لئے بقول خود حسرت ؎

تونے حسرتؔ یہ نکالا ہے عجب رنگِ غزل
اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

❑❑❑

Vol.-21 Issue No. 3
January - March 2024
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी पत्रिका
اُتر پردیش اردو اکادمی مجلہ

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی نئی کتابیں

475/-

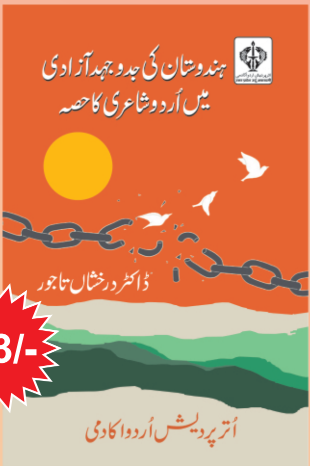

603/-

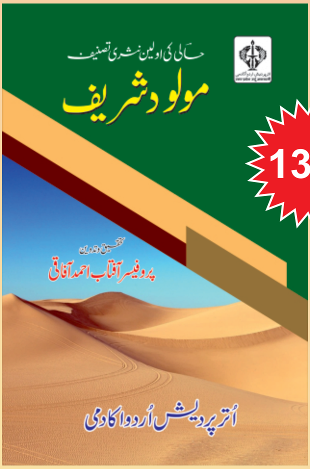

131/-

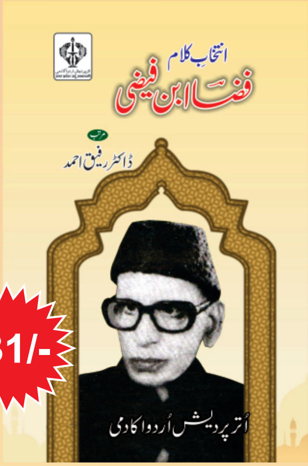

131/-

رابطہ کریں

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ گومتی نگر، لکھنؤ- 226010

سیل ڈپو : 7081007078